کہی نہ جائے



ممتاز مفتی

کہی نہ جائے

ممتاز مفتی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

مطبع ——— فیروز سنز لاہور

مجلّد ——— 969 0 01082 4

انتساب

جو میری زندگی کا سب سے بڑا مشاہدہ تھا جو میرے لیے اللہ کی
سب سے بڑی دین تھا، جس نے میرے قلم کو ایک رُخ عطا کیا۔
قدرت اللہ شہاب کے نام بعد معذرت کہ میں اپنی آلودگی کی وجہ سے
کوئی مقام حاصل نہ کر سکا۔

ترتیب

اعتراف

۱۹۴۳ء میں میں نے اپنا پہلا مجموعہ "ان کہی" بڑے زعم سے پیش کیا تھا کہ میں دلوں میں چھپی ہوئی ان کہیاں، کہہ دوں گا۔

آج ۱۹۸۹ء میں میں اپنا آخری مجموعہ "کہی نہ جائے" پیش کر رہا ہوں۔ مجھے اعترافِ ہے کہ : ۔

"دل کی بات جو گھٹتے گھٹتے منہ تک آئے کہی نہ جائے"

۱۹۸۴ء میں میری کہانیوں کا جائزہ لیتے ہوئے قدرت اللہ شہاب نے کہا تھا "______" روغنی پتلے کے صنم خانہ آزری میں ادب کے ٹین ایجر کے لئے بہت بڑا سرمایہ نشاط، جنت نگاہ اور فردوس فخر و انبساط ہے۔

لیکن ممتاز مفتی جیسے تخلیق کار کو اب تک آتش نمرود کی بھٹی سے گذر جانا چاہئے تھا۔

تو اے شرمندہ ساحل
اچھل کر بے کراں ہو جا "___"

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی انا کی سلگائی ہوئی بھٹی سے نکل نہ سکا۔

مجھ میں اچھل پیدا نہ ہو سکی کہ بیکراں ہو جاتا۔

معروف فارانی

معروف فارانی سے میری ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔ ویسے میں اسے جانتا تھا۔ میں نے اس کی دو کتابیں پڑھی تھیں اور خاصا متاثر ہوا تھا۔ اس کی تحریر میں دلچسپی تھی، شوخی تھی، چھیڑ تھی۔

پھر اخبار میں اس کی تصویر دیکھی تو میں حیران ہوا۔ اس قدر عمر رسیدہ اور اتنی جوان تحریر۔

اس روز میں پیدل تھا۔ چلتے چلتے تھک گیا۔ ستانے کے لئے کنٹونمنٹ پارک میں رک گیا۔ پارک ویران تھا۔ سامنے بینچ پر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں کیا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اثبات میں اشارہ کیا۔

ارے یہ تو معروف معلوم ہوتا ہے میں نے سوچا۔ "آپ معروف فارانی ہیں نا"۔ میں نے پوچھا۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"آپ کی تحریر دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ آپ بوڑھے ہیں"۔

"یہ میری بدیقینی ہے۔" وہ بولا۔

"ارے ہم تو اسے خوبی سمجھتے ہیں۔"

"میں بھی خوبی سمجھتا رہا۔" اس نے مدہم آواز میں کہا "میں نہیں سمجھتا۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔" وہ بولا۔ "کوئی بھی نہیں سمجھتا۔" سیدھی بات پر کوئی نہیں سوچتا جب تک اس میں ٹیڑھ نہ ہو۔" سامنے پڑی ہو پھر تو وہ درخور اعتنا ہی نہیں ہوتی چاہے کیسی بھی ہو۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ سمجھ گیا کہ بات میرے۔ پلے نہیں پڑی۔ "آپ کا نام؟" اسے پوچھا۔

سعید۔ میں نے جواب دیا
"سعید صاحب!" وہ بولا۔ دیکھئے نا۔ سیدھی بات ہے۔ میری تحریر کو مجھ سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ تحریر اور ہے۔ میں اور ہوں یعنی میں ایک نہیں دو ہوں۔ وہ نہیں ہوں جو مجھے ہونا چاہئے۔ ہپوکریٹ کہہ سکتے ہیں۔"
"آپ عجیب باتیں کر رہے ہیں؟" میں نے کہا
"ہاں۔" وہ بولا "ہم سچائی سے اس قدر بیگانہ ہو چکے ہیں کہ سچی بات عجیب لگتی ہے۔"
"مطلب ہے کہ آپ مطمئن نہیں ہیں۔" میں نے پوچھا
"ہوں۔ بہت مطمئن ہوں۔ نہیں ہونا چاہئے مگر ہوں۔ یہ اطمینان خود ساختہ ہے۔ خود فریبی ہے۔ مجھے وہ کیفیت حاصل نہیں جسے "یونی سن" کہتے ہیں۔" وہ رک گیا۔ کچھ دیر کے لئے خاموش رہا۔ پھر بولا۔
"سیانے کہتے ہیں بی دائی سلف۔ سچ "کہتے ہیں۔" میں اپنا سلف نہیں بھی رہا۔ ایک نمائشی سلف جی رہا ہوں۔ جو میں نے خود بڑی محنت سے بنا رکھا ہے۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنستا اور پھر آہ بھر کر بولا
"میں ایک نہیں رہا، مسٹر سعید۔ دو ہو گیا ہوں۔ ایک وہ جو ہوں۔ ایک وہ جو سمجھتا ہوں کہ ہوں۔ دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ سعید صاحب گھر میں دوج پڑ گئی ہے۔ گھر میں دوج پڑ جائے تو جینا مشکل ہو جاتا ہے۔" وہ پھر خاموش ہو گیا۔ دیر تک کھویا رہا۔ پھر دفعتاً سر اٹھایا۔ بولا۔ "اور یہ سب آپ کا قصور ہے۔"
میں گھبرا گیا۔ میرا قصور۔
"ہاں۔ آپ کا۔" وہ بولا۔ "آپ قاری ہیں نا۔ آپ کا مطالبہ ہے کہ نوجوان خیالات ہوں۔ شوخیاں ہوں۔ رنگ رس کی ہولی کھیلوں۔ پھلجھڑیاں چلاوں۔ آپ تالی بجاتے رہے۔ میں فریب کھاتا رہا۔ جی کہ دو ہو گیا۔
"سعید صاحب" وہ تازہ دم ہو کر بولا۔ "یہاں کوئی بھی کسی کو اپنی عمر کے مطابق جینے نہیں دیتا۔ نوجوانوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ عمر رسیدہ بن کر جئیں۔ بوڑھوں کو اس بات پر مائل کرتے ہیں کہ وہ نوجوان بن کر جئیں۔

ہم زبردستی ایک کو دو بنا دیتے ہیں۔ " دوج ڈال دیتے ہیں۔ اس رات میں معروف کی باتوں پر سوچتا رہا۔ کبھی لگتا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ پھر خیال آتا ہٹاؤ۔ ایک بڈھے خبطی کی باتوں پر کیوں خود کو پریشان کر رہے ہو؟ "

دو ایک دن میں اس کی باتوں پر سوچتا رہا پھر اس کا خیال ذہن سے نکل گیا۔

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ مجھے معروف یاد آ گیا۔

یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔

ایک روز اتفاق سے میں بچوں کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں سبھی لوگ بیٹھے تھے۔ میری بیوی، دو جوان بیٹیاں اور چھوٹا بیٹا۔ وہ سب سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ کوئی اہم بات زیر بحث تھی۔ میں داخل ہوا تو وہ ایک دم چپ ہو گئے۔ یوں جیسے کوئی بیگانہ آ گیا ہو۔ اس پر مجھے دھچکا لگا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ پہلے بھی دو ایک بار ایسا ہوا تھا لیکن کیوں، ایسا کیوں ہوا، ایسا کیوں ہوتا ہے، گھر میرا ہے، بیوی میری ہے، بچے میرے ہیں، میں بیگانہ تو نہیں ہوں۔

میں نے شدت سے محسوس کیا کہ گھر میں ہم نہیں رہتے بلکہ وہ رہتے ہیں اور میں رہتا ہوں۔ وہ چار ہیں میں اکیلا ہوں۔ اپنے گھر میں اکیلا۔

جوں جوں میں اس بات پر سوچتا، میرے دل میں دوج پیدا ہوتی گئی۔ دفعتاً مجھے معروف کی بات یاد آ گئی جس گھر میں دوج پیدا ہو جائے وہاں رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیا وہ سچ کہتا ہے کیا ہم ایک سے دو بن جاتے ہیں۔ اس روز مجھے معروف سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ شام کو میں کنٹونمنٹ پارک جا پہنچا۔ وہ اسی بینچ پر بیٹھا تھا۔ میں نے سلام کیا۔

اچھا آپ ہیں۔ کیا نام ہے؟۔ ہاں سعید صاحب۔ بیٹھئے مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ میموری کا فیوز اڑ چکا ہے۔ صرف حال ہی حال رہ گیا ہے وہ بھی ایک لمحہ۔ ماضی مٹ گیا ہے۔

آپکے مزاج اچھے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

بیمار ہوں۔ وہ بولا۔ بہت بیمار ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ آپ بیمار پڑتے ہیں۔ میں بیمار جیتا ہوں۔ اس عمر میں بیماریوں کے ساتھ جینا سیکھنا پڑتا ہے۔ بیچارے اعضاء۔ چل چل کر تھک گئے ہیں۔ کہتے ہیں اب بس کرو۔ بہت ہو گیا۔

لیکن آپ بیمار دکھتے نہیں۔ میں نے کہا۔
ہاں دکھتا نہیں۔ لیکن سعید صاحب۔ بیماری اندر کی چیز ہے. باہر کی نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے ایک گفٹ دے رکھا ہے۔ بیماری کے باوجود ورکنگ فٹ نس قائم رہتی ہے۔
آپ اسے مانتے ہیں۔ میں نے اسے چھیڑا۔
وہ مسکرایا۔ کہنے لگا جس نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو۔ باہر سے۔ اندر سے بھی۔ اسے کون نہیں مانے گا۔ سب مانتے ہیں۔ جو نہیں مانتا وہ جھوٹ بولتا ہے خود فریبی میں مبتلا ہے۔ وہ رک گیا پھر بولا۔
آپ ماننے کی بات کر رہے ہیں۔ میں بھی تو اس سے لبالب بھرا بیٹھا ہوں۔ جیسے گھڑا پانی سے بھرا ہوتا ہے۔ اگرچہ میں اس کے احکامات کا عامل نہیں ہوں۔ لیکن یہ سرکشی نہیں. نافرمانی نہیں۔ سستی ہے. بے عملی ہے۔ اس کے باوجود اس نے مجھے ریجیکٹ نہیں کیا۔ مجھ سے رابطہ قائم رکھا ہے۔
آپ کی کیا عمر ہوگی؟ میں نے پوچھا۔
۸۵ سال۔ وہ بولا۔ یہ چینج اوور کی عمر ہے اس عمر میں مجھے خود کو ادھر سے کاٹ کر ادھر سے جوڑنا چاہئے۔ ادھر سے بے تعلق ہو کر ادھر سے تعلق پیدا کرنا چاہئے۔
تو آپ ادھر بے تعلق پیدا کرنے کے لئے یہاں پارک میں آبیٹھتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔
نہیں۔ وہ بولا۔ بالکل نہیں۔
تو کیا آپ منظر دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔
نہیں۔ وہ بولا۔ دراصل میں اپنی بیوی سے جان چھڑانے کے لئے یہاں آتا ہوں۔ گھر میں صرف ہم دو میری بیوی اور میں۔ سارا گھر میری بیوی سے بھرا ہوا ہے۔ اس قدر بھرا ہوا ہے کہ میرا سانس رکنے لگتا ہے اور میں گھبرا کر یہاں آبیٹھتا ہوں۔
گھر میں بچے نہیں کیا۔ میں نے پوچھا۔
ایک بیٹا تھا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد ایک دن اس نے کہا۔ بابا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں کیا۔
میں نے کہا۔ پوچھو۔

کہنے لگا۔ بابا۔ میں نے تیس سال آپکے خیالات کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو باقی زندگی میں اپنے خیالات کے مطابق بسر کر لوں۔
جواب میں میں کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ بے شک بصد خوشی۔
وہ کینیڈا چلا گیا۔ وہاں اس نے شادی کر لی۔ چار چھ مہینے اس کے خط آتے رہے۔ پھر بند ہو گئے۔ بس۔ جب سے میں اور میری بیوی اکیلے رہ گئے ہیں۔
آپ اپنی بیوی سے جان کیوں چھڑاتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ آئی ہیٹ ہر۔ وہ بولا۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ کھولتی ہوئی نفرت۔
یہ سن کر میں گھبرا گیا۔ گردن جھکا کر بیٹھا رہا۔
کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔ سعید صاحب۔ بیوی سے صرف دو قسم کا تعلق ہو سکتا ہے۔ یا آپ اس سے محبت کر سکتے ہیں یا نفرت۔ بیشتر میاں اسے برداشت کرتے ہیں سعید صاحب۔ نسائیت شہد کی طرح ہوتی ہے۔ جب شہد چو جاتا ہے تو پیچھے کھگا رہ جاتا ہے۔ میری بیوی عرصہ دراز سے ایک کھگا ہے۔ کہتے ہیں کسی نے دانش ور سے پوچھا کہ زندگی میں سب سے حسین چیز کیا ہے۔ اسنے جواب دیا کہ عورت۔ پوچھنے والے نے پھر پوچھا کہ زندگی میں سب سے بدصورت چیز کیا ہے۔ اس نے کہا۔ عورت۔ سچ کہا اس نے۔ کیوں سعید صاحب۔ دراصل دنیا میں سب سے حسین چیز نسائیت ہے جب عورت میں سے نسائیت ختم ہو جاتی ہے تو وہ نہ عورت رہتی ہے نہ مرد۔ پتہ نہیں کیا بن جاتی ہے۔
میری بیوی اور میں ہم دو غیر جنس ہیں جو سالہا سال سے ایک پنجرے میں قید ہیں۔ ایک کوا اور ایک کچھوا۔
وہ بولے جا رہا تھا۔ اور میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسکے اندر بہت سی باتیں بھری ہوئی تھیں۔ بہت دیر سے اسے کوئی سننے والا نہ ملا تھا۔
آپ یہ باتیں تحریر میں کیوں نہیں لاتے۔ میں نے اسے چھیڑا۔ کیسے لاؤں۔ وہ بولا۔ لوگ مخملی باتیں سننا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ پھلجھڑیاں چلاؤ۔ تلخ باتیں سننے کے لئے کون تیار ہے۔
سعید صاحب۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑھاپا عمر کا ایک محترم دور ہے۔ پرسکون. مطمئن۔ کہتے ہیں تم سلامت رہو ہزار برس۔

انہیں پتہ نہیں کہ بڑھاپے میں جینا کس قدر مشکل ہے۔ اک عذاب ہے۔ صرف وہی لوگ اس عذاب کو جھیل سکتے ہیں جو "اس" سے لو لگا لیتے ہیں۔ یہ سارا عذاب "میں" کا ہے "میں" سے توجہ ہٹا لو تو عذاب مدہم پڑ جاتا ہے لیکن یہ ایک مشکل کام ہے۔ بہت مشکل۔ کاش کہ میں ایسا کر سکتا۔ اس نے لمبی آہ بھری۔

اب ایک ہی صورت ہے سعید صاحب مجھے چلا جانا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں نا، گو وہایل دی گوینگ از گڈ۔ پیشتر اس کے کہ موت رحمت بن جائے۔ میرے لے دعا کرو سعید صاحب

آپ دعا کو مانتے ہیں معروف صاحب میں نے پوچھا۔

بہت بہت، وہ بولا۔ بے حد۔ وہ رک گیا۔ پھر کہنے لگا۔ شکر ہے وہ ہماری دعائیں منظور نہیں کرتا ورنہ مصیبت پڑ جائے اور ـــــــــ

میں سمجھا نہیں۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔

بھئی ہم بڑے کنفیوزڈ ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ ہمیں پتہ نہیں کہ ہمیں کیا مانگنا چاہئے۔ ہم ایک نہیں دو ہیں۔ ایک ہوتے تو پتا ہوتا نا لیکن ہم تو بٹے ہوئے ہیں۔ اچھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا مجھے اب جانا چاہئے۔ تکلیف بڑھتی جا رہی ہے۔

چلئے میں چھوڑ آؤں۔ میں نے کہا۔ میرے پاس گاڑی ہے۔

نہیں نہیں وہ بولا۔ وہ سامنا گھر تو ہے میرا۔ سڑک کے پار۔ میں نے اسے سہارا دیا اور ہم دونوں چل پڑے۔

اس ملاقات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ معروف سچ کہتا ہے میرے اندر کی کشمکش مجھے نظر آنے لگی۔ ڈھکی چھپی دوج باہر نکل آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بھی اپنی بیوی کو صرف برداشت کر رہا ہوں۔ چار ایک دن کے بعد مجھے پھر شوق چرایا کہ معروف سے ملوں۔ پارک میں پہنچا تو بینچ خالی پڑا تھا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ گھر جاؤں یا نہ جاؤں۔ اتنے میں باغ کا مالی آ گیا۔ کہنے لگا۔ وہ بڈھا کئی دن سے نہیں آیا۔ بیمار پڑا ہے۔

یہ سن کر میں نے جا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ایک خاتون بولی۔ کون ہے؟

میں نے کہا۔ میں سعید ہوں معروف صاحب کو دیکھنے آیا ہوں۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر آواز آئی۔ آ جایئے۔

میں اندر داخل ہوا۔ گاؤ تکیے کا سہارا لئے وہ بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ سانس اکھڑا ہوا تھا۔ کرب میں مبتلا تھا۔

مدہم آواز میں بولا۔ اب بھی پردہ کرتی ہے جیسے اس کے پاس دیکھنے کے قابل کوئی چیز ہو۔

کیا حال ہے آپ کا۔ میں نے پوچھا

مر رہا ہوں۔ وہ بولا۔ دورے پڑ رہے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد پھر دورہ پڑا۔ کرب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ نہیں نہیں۔ وہ دیوانہ وار چلایا۔ میں نہیں مروں گا۔ نہیں مروں گا۔ کیسے مر سکتا ہوں۔ ظاہر تھا کہ وہ جان کندن کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اپنی پوری ول پاور سے موت کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا۔

دورہ مدہم ہوا تو اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ بولا۔ تو دیکھتا نہیں۔ نظر نہیں آتا تجھے میں کیسے مر سکتا ہو۔ بے شک میرے لئے رحمت ہے لیکن اسکا کیا ہو گا۔ مر گیا تو کیا کرے گی۔

میں نے رسما کہا۔ اللہ ان کو سہارا دینے کی کوئی صورت پیدا کر دیں گے۔

آپ فکر نہ کریں۔

نہیں نہیں وہ بولا۔ کیا نام ہے آپ کا۔ آپ نہیں سمجھتے۔ اسے سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ عورت ہے، عورت۔ یہ اپنے لئے نہیں جیتی دوجے کے لئے جیتی ہے کسی دوجے کا ہونا ضروری ہے جس کے لئے یہ جی سکے۔

یہ میرے لئے جی رہی ہے۔ میرا دھیان رکھنے کے لئے۔ میری ٹہل سیوا کرنے کے لئے۔ میں مر گیا تو یہ کس کے لئے جئے گی۔ نہیں میں نہیں مروں گا۔ مجھے اس کے لئے جینا ہے۔ اگرچہ جینا مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے لیکن کیا کیا جائے، مجبوری ہے۔ دروازہ بجا۔

میں نے اٹھ کر کنڈی کھولی۔

ایک جوان لڑکا ہاتھ میں بیگ پکڑے اندر داخل ہوا۔

ہائی ڈیڈی۔ اس نے معروف کی طرف دیکھ کر کہا۔

بڑے وقت پر آئے ہو۔ معروف نے زیر لب کہا اور پھر آرام سے اپنا سر سرہانے پر ٹیک دیا۔

خاتون بیٹے کی آواز سن کر باہر نکل آئی تھی۔ لڑکے نے دوڑ کر ماں کو آغوش میں لے لیا۔

میں نے سوچا۔ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ میں اٹھا۔

مجھے اجازت دیجئے۔ میں نے معروف سے کہا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

میں قریب گیا۔

ارے وہ تو جا چکا تھا۔

کہانی کی تلاش

تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تھک کر چور ہو گیا تو میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔
سڑک کے کنارے ایک تھڑے پر میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔
مجھے اس کا ساتھ پسند نہیں۔ بڑا نکتہ چین ہے۔ بات بات پر ٹوکتا ہے۔ لیکن وہ میری مجبوری ہے۔ میں اس سے پیچھا چھڑا نہیں سکتا۔
میں نے گردوپیش پر نگاہ ڈالی۔ پاکستان کا حسین ترین شہر اسلام آباد میرے ارد گرد پھیلا ہوا تھا کیوں نا اسلام آباد پر کہانی لکھوں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔
اونہوں۔ وہ بولا۔ یہ شہر ہمارا شہر نہیں ہے۔
کیوں۔ میں نے غصے سے اسے دیکھا۔
اس میں اپنوں کا رنگ نہیں ہے۔ بیگانہ ہے۔
اسلامی مملکت کا دارالخلافہ ہے بھئی۔
حرف نام کا اسلامی ہے۔ مساوات کا بیری ہے۔
ذات پات کا شوقین۔ اونچ نیچ کا مارا ہوا۔
کون سی ذات پات۔ میں نے پوچھا۔
عہدوں کی۔ گریڈوں کی۔ تم اس پر کہانی نہیں لکھ سکتے۔
کہانی تو اپنوں کی ہوتی ہے۔ بے گانوں کی نہیں۔
میں نے اسکی بات کا جواب نہ دیا۔
دیر تک ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔
میری مشکل یہ ہے کہ جب تک مرکزی خیال نہ ہو میں کہانی نہیں لکھ سکتا۔ اگر کہانی کے پاس کچھ کہنے کو نہیں ہے تو کیا فائدہ۔ گونگی کہانی کو کوئی کیا کرے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کہانی چیخ کر نہ بولے۔ لب نہ کھولے۔ آنکھ سے بولے۔ اکھ نال گل کر گئی۔

کئی ایک دن سے میں کہانی کی تلاش میں تھا۔ کیا لکھوں، کسی موضوع پر لکھوں۔ ایسی بین بجاؤں کہ سانپ نکل آئے۔

وہ ہنسا۔ بولا۔ بغل میں کٹورہ۔

کہاں ہے کٹورہ۔ میں نے پوچھا۔

اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ تم اس موضوع پر کیوں نہیں لکھتے۔ سارے لکھاڑ اس پر لکھتے ہیں۔ آج کے دور کا من بھاتا موضوع ہے۔ آج کے بوٹے پر لگا ہوا پھل ہے

میں نے مڑ کا دیکھا، درختوں کے پیچھے کچی آبادی تھی۔ انتظامیہ نے اسے درختوں اور دیواروں کے پیچھے چھپا رکھا تھا کہ دودھ میں مکھی کوئی دیکھ نہ لے۔

میں سڑک کے نیچے اتر گیا۔ درختوں کے جھنڈ سے دیکھا، وہاں بیس تیس جھونپڑے تھے۔ دو رویہ مکانوں کے درمیان میں کھلا میدان تھا۔ میدان میں یہاں وہاں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ بیٹھے تھے۔ حقے چل رہے تھے۔ بچے چارپائیوں کے ارد گرد دوڑ رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ چلا رہے تھے۔ عورتیں اوپن ایر باورچی خانوں میں چولہوں پر ہانڈیاں چڑھائے بیٹھی تھیں۔ ہاتھ چل رہے تھے۔ چوڑیاں چھنک رہی تھیں باتیں ہو رہی تھیں۔

اے بابو! قریب ہی سے آواز آئی۔ دیکھا تو پاس ہی ایک بڈھا بیٹھا جوتے گانٹھ رہا تھا۔

کس سے ملنا ہے؟ مجھے اس نے پوچھا۔

کسی سے بھی نہیں۔

پھر دیکھ کیا رہا ہے تو؟

دیکھ رہا ہوں کتنی غربت ہے۔ کتنا دکھ ہے۔

کہاں ہے دکھ۔ وہ بولا۔ یہاں تو میلہ لگا ہوا ہے۔ بابو جا۔ سارے اسلام آباد کا چکر لگا۔ گھوم پھر کے دیکھ۔ کہیں بھی ایسا میلہ نہیں لگا ہو گا۔ سب کمروں میں بند ہیں۔ نہ بول نہ بلارہ۔ بوہے بند، ہونٹ بند، دل بند۔

اور بابو یہ کچی آبادی جو تو دیکھ رہا ہے یہ آبادی نہیں ہے۔ یہ تو ایک کنبہ ہے۔ ایک کو پیڑ ہووے ہے تو دوجا درد سے ہائے ہائے کرے ہے۔ ایک کا چولہا نہیں جلے ہے تو دوجا ہانڈی میں ایک مٹھ دال اور ڈال لے ہے۔ تو غربت کو کیا سمجھے ہے بابو۔ غربت میں لوگ ان بین دوجے کے نیڑے آجاویں ہیں۔ امارت میں دور ہٹ جاویں ہیں۔

اور تجھے پتہ ہے بابو۔ پاکستان پر کیا پتا پڑی ہوئی ہے ہمیں جینے کی ضرورت تھی۔ اس سے زیادہ مل گیا ہے۔ زیادہ مل جائے تو شر جاگ اٹھے ہے۔ فساد کے بلبلے پیدا ہو جاویں ہیں۔

تو مسلمان ہے کیا؟ بڈھے نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر تو اس کو جانتا ہے۔

کس کو۔

وہ جو سب سے بڑا بندہ تھا۔ جو اللہ کا پیارا تھا۔ اللہ نے کہا میرے پیارے۔ بول تو کیا چاہتا ہے۔ تو جو مانگے گا۔ ملے گا۔ جو چاہے گا۔ ہو گا۔ بتا امارت میں رہنا چاہے گا یا غربت میں۔ اس نے غربت مانگ لی۔ غربت میں کوئی صفت ہو گی ہی نا کہ اس نے غربت مانگی۔

مایوس ہو کر میں پھر چل پڑا۔

کہانی کی ڈھونڈ میرے سر پر جنون بن کر سوار تھی۔

چلتے چلتے میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔

میرے سامنے وہ کھڑی تھی۔

گلاب کا ایک بوٹا۔ اوپر ایک ڈوڈی۔ ادھ کھلی ادھ بند۔ ادھ گلابی ادھ ہری۔

ہونٹ بند تھے۔ آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔

انگلیوں سے میگنیٹک لہریں نکل رہی تھی۔

آؤ۔ وہ بولی۔ میں ہوں وہ کہانی جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔

اونہوں۔ مت جاؤ۔ مت جاؤ۔ میرا ساتھی زیر لبی میں بولا۔ اس کی کہانی تو تم سالہا سال سے لکھ رہے ہو۔

میری کہانی۔ وہ بولی، سبھی لکھ رہے ہیں۔ نہ جانے کب سے لکھ رہے ہیں۔ لیکن کوئی لکھ نہیں پایا۔

اگر میری کہانی لکھی جاتی تو آج میں صرف آرائش و زیبائش نہ سمجھی جاتی۔ میری حیثیت
دیکھیں دکھن تک محدود نہ ہوتی۔ تیرے بھائی بند مجھے خوش وقتی نہ سمجھتے

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ مجھے سب باہر سے دیکھتے ہیں۔ کسی نے میرے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ کسی نے مجھے نہیں جانا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

دوسرا اس نے سر اٹھایا اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

میں تجھے جانتی ہوں۔ وہ بولی۔ تو ایلی ہے نا۔ میں ایلن ہوں۔ سنا تو نے۔ میں ایلن ہوں۔

اس نے ایک پوز بنایا اور یوں کھڑی ہو گئی جیسے مٹھاس اس کی اک پھوار ہو۔

مجھے ایسے لگا جیسے ورق میں لپٹی ہوئی مصری کی ڈلی ہو۔ جی میں آیا کہ منہ میں ڈال کر چوس جاؤں۔

دوسرا میرا ساتھی بولا۔ ہوش کر میرا تو منہ ہی نہیں ہے۔ جب تھا تب جرأت نہ تھی۔ اب خالی جرات کا جھنجھنا بجانے سے فائدہ؟

دیکھا۔ وہ بولی۔ مجھ میں دونوں روپ ہیں۔ دیوی بھی ہوں۔ ناری بھی ہوں۔ انگاروں سے بھسم بھی کر سکتی ہوں۔ سوکھے کو ہرا بھرا بھی کر سکتی ہوں۔ میں تیری کہانی ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے تو کسی اور پر کہانی نہیں لکھ سکتا۔

میں لکھوں گا تجھ پر کہانی۔ میں نے کہا۔

رک جا۔ میرا ساتھی بولا۔ اس نے میرا بازو تھام لیا۔

بے شک یہ رنگ رس بھری کہانی ہے۔ لیکن یہ ایسی کہانی ہے جسے صرف جیتا جا سکتا ہے۔ لکھا نہیں جا سکتا۔ تو بیتنے میں کھو جائے گا۔ لکھنے کا ہوش نہیں رہے گا

شام پڑ چکی تھی۔ پتہ نہیں شام اتنی اداس کیوں ہوتی ہے۔ مدہم اداسی میٹھی اداسی
ایسے لگتا ہے جیسے شام نے بال بکھیر رکھے ہوں۔ چرا سا ہوا ہو۔ انتظار۔ مایوسی بھرا انتظار۔

راگ ودھیا والوں نے شام کے راگ میں آگ لگا رکھی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ وہ تو بڑے سیانے ہیں پر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے شام آگ نہیں سلگن ہے۔ مدہم سلگن جیسے دیئے میں تیل

نہ رہا ہو۔ سوکھی بتی سلگ رہی ہو۔
دکان میں اندھیرا گاڑھا ہوتا جارہا تھا۔ ایک بتی سلگ رہی تھی۔ وہ تجوری کھولے بیٹھا گن رہا تھا۔
میرا ساتھی بولا۔ رک جاؤ۔ اس سیٹھ کو دیکھ رہے ہو نا۔
دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا۔
تم نے اس پر کبھی کہانی نہیں لکھی۔
اس میں کوئی کہانی ہو تو لکھوں۔
سبھی لکھتے ہیں۔
ہاں لکھتے ہیں پر وہ کہانی نہیں ہوتی۔ غم و غصے کا اظہار کہانی نہیں ہوتی۔ کہانی نعرے نہیں لگاتی۔ اودھم نہیں مچاتی۔ اشتعال پر نہیں ابھارتی۔ مزاحمت کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتی۔ کہانی تو اک چھوٹا سا چشمہ ہوتی ہے جو دھرتی سے ابلتا نہیں۔ رستا ہے. بوند بوند رستا ہے۔ ہمدردی کا چشمہ. دکھ بھرے لگاؤ کا چشمہ. بھیگ ہی بھیگ۔
جھوٹ بولتے ہو۔ اس نے مجھے ڈانٹا۔ تمہاری کسی کہانی میں بھیگ نہیں ہوتی۔ سوکھی کاٹھ۔
سچ کہتے ہو۔ میں اپنی کسی کہانی میں بھیگ پیدا نہ کرسکا۔ قاری کو بھگو نہ سکا۔ لاکھ کوششیں کی پر بات نہ بنی۔ بیسیوں لکھیں پر کہانی نہ لکھ سکا۔
جھک مارتے رہے۔ وہ بولا۔
نہیں جھک نہیں مارا۔
تو پھر
چمکیلی باتیں کرتا رہا۔ دکھاوے کی باتیں۔ توجہ طلبی کی باتیں. پھلجھڑیاں چلاتا رہا۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔
اپنی ڈگڈگی بجاتا رہا نا۔ کہانی اپنی بات نہیں ہوتی۔ وہ بولا۔ دوجوں کی بات ہوتی ہے۔ کیا تم اپنی بات کرنے سے کبھی نہیں اکتاتے؟۔
کیا مطلب؟ میں نے غصے سے پوچھا۔
اب بھی تو کہانی کے پردے میں تم اپنی بات کر رہے ہو۔ سیٹھ کی بات کیوں نہیں کرتے۔

کیوں کہتے ہو کہ اس میں کوئی کہانی نہیں ہے۔
یہ تو دولت کا قیدی ہے۔ دولت نے اسے ہائی جیک کر رکھا ہے۔ اس بیچارے میں تو میں بھی نہیں رہی۔ دل کی جگہ پیسہ ٹک ٹک کر رہا ہے۔ دنیا سے بھی گیا۔ خود سے بھی گیا۔
بیچارہ مظلوم
اس کی مظلومیت پر کہانی لکھو۔
نہ نہ نہ نہ
کیوں۔ کیا لکھ نہیں سکتے؟
لکھ سکتا ہوں۔
پھر لکھتے کیوں نہیں۔
ڈرتا ہوں۔
کس سے ڈرتے ہو؟
ان سے ڈرتا ہوں۔ جو اسے ظالم سمجھتے ہیں۔
کھڑاک سے دکان کا دروازہ بند ہو گیا۔

وہ دیکھو۔ وہ۔ وہ چلایا۔ تیرا موضوع۔
میں نے سر اٹھایا۔ سامنے دربار جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔
نہیں۔ میں نے زیر لب کہا۔ یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ یہ داتا لوگ ہیں۔ بزرگ ہیں۔ اللہ والے ہیں۔ یہ چوتھی سمت میں جیتے ہیں۔ زیادہ دیکھتے ہیں۔ زیادہ سنتے ہیں زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ زماں اور مکاں سے بے نیاز ہیں۔ ان کا میں احترام کرتا ہوں لیکن میں ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ ان کے بارے میں منہ کھولوں۔ نہ نہ نہ بھائی چھوٹا منہ بڑی بات۔
تم داتا کو کیوں دیکھتے ہو۔ بزرگ کو کیوں دیکھتے ہو۔ وہ بولا۔ کرامتوں کو کیوں دیکھتے ہو۔ معجزوں کو کیوں دیکھتے ہو۔
تم اس بندے کو کیوں نہیں دیکھتے جو داتا کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ جو اتنا عظیم تھا کہ اس نے داتا

کا مرتبہ پالیا۔

سب داتاؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ سرکار قبلاؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ باباؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ کراماتوں کے چھنکنے چھنکاتے ہیں۔ اس عظیم بندے کی بات کوئی نہیں کرتا جس نے انہیں بابا بنا دیا۔ سرکار قبلہ بنا دیا۔ سلطان الہند بنا دیا۔ داتا بنا دیا۔ تو اس بندے کی بات کیوں نہیں کرتا۔ اسکی آواز میں غصہ کھول رہا تھا

ہم دونوں درگاہ میں داخل ہو چکے تھے۔

ہمیں دیکھ کر درگاہ کا متولی بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ وہ بندہ تو ایک ہی ہے۔ ایک ہی ہے جسے دو جہانوں کا مالک بنا دیا گیا پر وہ بندہ بن کر جیا۔ صرف بندہ بن کر۔ نہ بابا بنا نہ سرکار قبلہ بنا، نہ داتا بنا نہ کراماتیہ بنا نہ معجزاتی بنا۔ صرف بندہ۔ صرف بندہ صرف بندہ صرف بندہ۔ گنبد چلایا۔

صرف بندہ. صرف بندا۔ باہر سے یوں آواز آئی جیسے آسمانوں میں گنبد کی آواز کی گونج تھر تھرا رہی ہو۔

ساری کائنات اس گونج سے بھری ہوئی تھی۔ صرف بندہ۔ صرف بندہ۔

اندر والی

انیس اور ساونی کی ملاقات ایک حادثے کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ وہ ملاقات بذات خود ایک حادثہ تھی۔ اس رات گھن گھرج والی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی کار میں الگ الگ سفر کر رہے تھے۔ انیس ساون گڑھ جا رہا تھا ساونی جھنڈے والا۔ جب وہ دھاری وال کے قریب پہنچے تو بجلی کوندی۔ خوفناک دھماکہ ہوا اور پہاڑ سے دو تودے سڑک پر آ گرے. ایک آگے ایک پیچھے۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔

مجبوراً انہیں دھاریوال کے ریسٹ ہاؤس میں پناہ، لینی پڑی۔ ریسٹ ہاؤس میں دو ڈبل بیڈ کمرے تھے۔ انیس ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں داخل ہو کر دھم سے بستر پر پڑ گیا۔ ”ڈیش اٹ. وہ غصے میں بولا۔ پتہ نہیں یہ بلاک ایڈ کتنی دیر چلے گا۔ شہر سے بلڈوزر آئے گا پھر...... سارا پروگرام گڈ مڈ ہو گیا۔

انیس اسی سوچ میں پڑا تھا کہ دروازہ بجا۔ ”اس وقت کون آئے گا۔ شاید چوکیدار ہو۔“ دروازہ کھولا۔ تو ساونی کھڑی تھی۔

آپ کون ہیں؟ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

فی الحال تو پناہ گیر ہوں۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا اور بڑی بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ انیس نے پوچھا۔

میں اس کمرے میں اکیلی نہیں سو سکتی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ بولی۔

تو پھر۔ انیس نے پوچھا۔

میں آج رات آپ کی مہمان ہوں۔

یہ سنکر انیس کے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔

اونہوں۔ گھبرایئے نہیں۔ وہ بولی۔ میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گی۔

یہ پلنگ گھسیٹ کر ادھر لگا دیجئے پلیز۔

پلنگ گھسیٹتے ہوئے اس نے سوچا۔ لگتا ہے کوئی آوارہ عورت ہے۔ اگرچہ آوارہ عورتوں سے اسے نفرت تھی۔ چلو مفت میں ایک عیاشی کی رات ایسا کیا جاتا ہے۔ اس نے سوچا۔

"کہاں جا رہی تھیں آپ۔" انیس نے پوچھا۔

"جھنڈے والا جا رہی تھی۔ وہاں چوکی دینی ہے۔"

اوہ! انیس نے سوچا۔ طوائف ہے۔ مجرا کرنے جا رہی ہے۔ لیکن ہے بڑی جاذب نظر اور کلچرڈ بھی۔ جب وہ جوتا اتار رہی تھی تو انیس نے اپنی نگاہیں اس پر گاڑ دیں اور گلیڈ آئی چمکائی۔

اونہوں۔ اس نے سر اٹھا کر کہا۔ مجھے ایسی نظروں سے نہ دیکھئے۔

کیوں؟

اپنا وقت ضائع کریں گے آپ خواہ مخواہ۔ وہ بولی۔

یہاں کرنے کو اور ہے ہی کیا۔ وہ مسکرایا۔

ساری۔ مسٹر۔ وہ بولی آج میری باہر والی چھٹی پر ہے۔

باہر والی چھٹی پر ہے۔ اس نے حیرانی سے دہرایا۔

ہاں وہ بولی آج اندر والی کا دن ہے۔

میں سمجھا نہیں۔

ابھی آپ کو اندر والی سے ملاتی ہوں۔ ذرا صبر کیجئے۔

آپ ڈرتی ہیں کیا؟

نہ آپ سے نہ خود سے۔ وہ بولی۔ صرف بادل کی گھن گرج سے ڈر آتا ہے

اور وہ ہنسی یہ دو گھڑی کا میلا جو ہوتا ہے۔ ملاپ میلا۔ ہمارے لئے میلا نہیں رہا۔ روٹین ہے۔ اور روٹین سے ڈرتے نہیں۔ اکتا جاتے ہیں۔

انیس شرمندہ ہو گیا۔

جی برا نہ کیجئے۔ وہ مسکرائی۔ ایک منٹ کپڑے بدل لوں۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور سوٹ کیس اٹھا کر باتھ روم میں داخل ہو گئی۔

چار ایک منٹ کے بعد جب وہ باہر نکلی تو انیس حیران رہ گیا۔ اسکا خیال تھا۔ رات کا لباس بڑا جھل مل ہو گا۔ ریشمی نائٹی. امپورٹڈ پھولدار میکسی۔ بٹن کھلے ہوں گے۔ اندر سے ادھ ننگا

گلابی جسم جھانکے گا
ارے یہ کیا۔ میلی میلی شلوار قمیص۔ بکھرے بکھرے بال، پلاسٹک کے سلیپروں کو یوں گھسیٹتی ہوئی باہر نکلی جیسے باورچی خانے سے آلو چھیلتی آئی ہو۔
پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے لیکن ایسے ہوتا ہے کہ خواتین فریم کو اس قدر جھڑکیلا بنا دیتی ہیں کہ تصویر دب جاتی ہے۔ غسلخانے سے نکل کر وہ اور بھی نکھر آئی تھی۔
کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگی۔ لیجئے اب اندر والی ملاحظہ کیجئے۔
انیس نے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔
کیسی ہے۔ وہ بولی
سبحان اللہ۔ کیا بات ہے۔ انسی نے جھوٹ بول دیا۔
وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ اگر مرد اندر والی کو سبحان اللہ کہنا شروع کر دیں تو باہر والی چوک میں راون بن کر نہ کھڑی ہو اور اندر والی گھونگھٹ نکالے نہ بیٹھی ہو۔ سارا قصور مردوں کا ہے۔ وہ باہر والی کو ڈھونڈتے ہیں اسی پر نثار ہوتے ہیں اور عورت کا کیا ہے؟ بیچاری ___ جو پیا من بھائے وہی سہاگن کہلائے۔
آپ کی باہر والی میں تو بڑی بن ٹھن تھی۔ وہ بولا۔
وہ مسکرائی۔ بولی۔ بن ٹھن ہماری مجبوری ہے۔ باہر والی کے پاس بن ٹھن کے سوا ہے ہی کیا۔ مسکرانا۔ خوشی کا نہیں، بلاوے کا، لبھانا۔ ٹو پلیز اورز۔ بس
آپ پڑھی ہوئی ہیں؟ انیس نے پوچھا۔
کچھ کچھ
کتنا کچھ
سنیئر کیمبرج۔ وہ بولی
اوہ۔ اتنا کچھ
ہمارے ہاں آجکل جب تک سنیئر کیمبرج نہ ہو "میڈھی" نہیں کھلواتے
میڈھی کیا؟
افتتاح۔ اس نے سن کر کہا۔ ان آگریشن۔ حیرت سے انیس زیر لب بولا۔
اونہوں۔ وہ بولی حیرت نہیں ضرورت ہے۔ ایجنٹ کو متوجہ کرنے کے لئے ضروری ہے

تا۔ عین اس وقت بجلی پھر کڑکی۔ زور کا دھماکا ہوا۔ ساوُنی نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بولی۔ اللہ جی اب معافی دے دے۔

اللہ سے دوستانہ ہے کیا؟ وہ مسکرایا۔

بہت

وہ کیسے

جتنی باہر والی اللہ سے دور ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اندر والی قریب آ جاتی ہے اور جو ایک بار اللہ کے قریب آ جائے پھر وہ کب چھوڑتا ہے۔ سینے سے لگا لیتا ہے۔

ساوُنی کی باتیں سن کر انیس بھیگ گیا۔ کتنی سادگی تھی۔ کتنی سچائی۔ اب وہ اس کے لئے عورت نہ رہی تھی۔ اسکے عزائم صابون کے جھاگ کی طرح اڑ چکے تھے۔ وہ ریلیکس ہو گیا۔ کہنے لگا اک بات پوچھوں؟

پوچھیۓ؟ وہ بولی اب پوچھنے اور کہنے کے سوا رہ بھی کیا گیا ہے۔

ساوُنی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بولی۔ اندر والی کو باہر آنے اور بات کرنے کا موقعہ ہی کب ملتا ہے۔ آج دو سال کے بعد ـــــ وہ رک گئی

دو سال۔ انیس نے دھرایا۔ تمہارے ہاں اتنی پابندیاں ہیں کیا؟

صرف ایک پابندی۔ اس نے جواب دیا۔ کڑی پابندی کہ باہر والی کا کوئی رستہ نہ کاٹے۔ ہمارا تو دھندا ہی باہر والی کے زور پر چلتا ہے۔ باہر والی کو بناؤ سجاؤ۔ اس پر پھول پتیاں لگاؤ۔ وہ اندر والی کی بات نہ سنے۔ اسکی طرف توجہ نہ دے اور اندر والی کسمپرسی میں دم توڑ دے۔

آپ کی اندر والی میں تو بڑی جان ہے۔ وہ مسکرایا۔

یہی میری بدنصیبی ہے۔ ساوُنی نے کہا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ وہ سوکھ کر جھڑ جائے۔ لیکن ـــ وہ رک گئی۔ کمرے پر خاموشی چھا گئی۔ باہر بڑی بڑی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ گھن گرج مدہم پڑ گئی تھی۔

آپ کی اندر والی تو بری بھری ہے۔ انیس نے اسے پھر چھیڑا۔ اسے ساوُنی کی باتوں میں لذت آنے لگی تھی۔ اسکا جی چاہتا تھا کہ وہ باتوں کی پھلجھڑیاں چلاتی جائے حتیٰ کہ دن چڑھ جائے دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اسکی خاموشی بھیگی بھیگی تھی۔

کبھی محبت بھی ہوئی ہے آپ کو؟ انیس نے پھر اسے چھیڑا۔ اس نے سر اٹھایا اور زہرخند ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ہمارے ہاں محبت پر بین ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ نرتکی کا کام تو محبوبہ بن کر جینا ہے۔ اگر وہ کسی کی لگن لگا لے تو ۔۔۔

وہ رک گئی۔ یوں بیٹھی رہی جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ دکھی خواب۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولی۔ آپ طوائف کو نہیں سمجھتے۔ صراف طوائف ہی محبت کو سمجھتی ہے سمجھ. سکتی ہے۔ محبت کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس میں سے جسم کا کانٹا نکل چکا ہو۔

وہ خاموش ہو گئی۔ پھر آپ ہی آپ گنگنانے لگی۔

بھاویں تو جان نہ جان وے

وَیہڑے آ وَس میرے

اس نے چار ایک مرتبہ اس مکھڑے کو دھرایا۔ اس قدر ڈوب کر گایا کہ آنکھیں بھر آئیں۔

پہلی مرتبہ انیس کو ساوتی کے دکھ کا اندازہ ہوا۔

اس وقت وہ کہہ دینے کے موڈ میں تھی ۔۔۔ مدھم خواب آلود آواز میں بولی۔ طوائف کے دل میں صرف ایک خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی ایک کی ہو کر جیئے۔ ہر کسی کی نہ رہے۔ ایسی بھی ہیں جن کی یہ خواہش تڑپ تڑپ کر مرجاتی ہے۔ کاش کہ میری بھی مرجاتی۔ اس نے لمبی سانس بھری۔

آپ کو محبت ہو گئی نا۔ انیس زیرِ لب بولا

اس نے سر اٹھا کر انیس کی طرف بھیگی بھیگی نظروں سے دیکھا۔ کہنے لگی۔ پتہ نہیں وہ محبت تھی یا کیا تھی۔ اک لگن لگ گئی۔ وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ اٹھتا بیٹھتا اچھا لگتا تھا۔ بولتا اچھا لگتا تھا۔ وہ میری طرف یوں دیکھتا تھا جیسے مجھ سے گھن آتی ہو۔ پھر بھی وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔

میرے دل میں ایک خواہش جاگی۔ ساوتی بولی۔ یوں جاگی جیسے بوتل سے جن نکلتا ہے کہ میں اسکی ہو کر جیوں۔ وہ جائے تو دروازے تک چھوڑنے جاؤں۔ آئے تو اسے لینے آؤں۔ دروازے پر بیٹھ کر اسکا انتظار کروں۔ اسکی جرابیں دھوؤں۔ کپڑے استری کروں۔ اسکے لئے روٹی پکاؤں۔ وہ بیٹھ کر کھائے تو اسے پنکھا کروں۔ لیٹے تو اسکے پاؤں دباؤں۔ میری خواہش تھی کہ ہم دونوں ایک گھر میں رہیں۔ وہ گھر والا ہو میں گھر والی۔

زندگی بھر نہیں تو چھ مہینے. تین مہینے ہی سہی. بس یہی آرزو تھی میری۔ وہ خاموش ہو گئی۔

باہر ہوا درختوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ پتے آہیں بھر رہے تھے۔

دفعتاً اس نے سر اٹھایا۔ بولی۔

میں نے بڑی مشکل سے اسے منایا پہلے تو وہ مانتا ہی نہیں تھا۔ بڑی منتیں کیں۔ آخر وہ مان گیا۔ اسے مجھ پر ترس آگیا۔ میں۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔ میں جس کے چوبارے پر موٹروں کی لائن لگ جاتی تھی. بڑے بڑے سیٹھ ہاتھ جوڑتے تھے۔ وہ میں

چلو ترس ہی سہی۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ پندرہ دن ہم اکٹھے رہے. پندرہ دن میری زندگی کا سرمایہ ہیں

صرف پندرہ دن کے لئے میری اندر والی برا جمان رہی۔ پندرہ دن باہر والی ڈیوڑھی کی دہلیز پر کھڑی میرا منہ تکتی رہی۔

ان پندرہ دنوں کے سہارے میں ساری زندگی بتا سکتی ہوں۔ اس نے آہ بھری اور چپ ہو گئی۔

بجلی زور سے کڑکی تو انیس جاگ پڑا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ ساوتی کی بپتی میں اسقدر ڈوب گیا تھا کہ اسے یاد نہ رہا تھا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کس سے بات کر رہا ہے۔ پھر سے بات چلانے کے لئے وہ بولا۔ آپ نے تو تین مہینے اکٹھے رہنا تھا۔

ہاں تین مہینے ــــــ ان پندرہ دنوں میں وہ میرے قریب آگیا تھا۔ اتنا قریب کہ ساری زندگی اکٹھے رہنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔ میں تجھے کیا سمجھا کرتا تھا۔ پر تو تو کچھ اور نکل آئی۔

کیا سمجھا کرتا تھا؟ میں پوچھتی۔

میں سمجھتا تھا تو بائی ہے۔ لیکن تو تو عورت نکلی۔ اس بات پر مجھے ہنسی آتی۔ میں اسے کہتی۔ دیکھ ہر بائی میں عورت ہوتی ہے جسے وہ دوپٹے کے پلو میں باندھے رکھتی ہے۔

حد ہو گئی۔ وہ کہتا تو تو بازار کی نہیں دکھتی۔ گھر والی دکھتی ہے۔

میں کہتی۔ شکر ہے میں تجھے نظر تو آئی۔ یونہی ہم دونچے باتوں کے غبارے اڑاتے رہتے۔

وہ پھر خاموش ہو گئی۔

تمہارا نام کیا ہے؟ انیس نے پوچھا

اس وقت وہ پندرہ دنوں کی یاد میں اس قدر بھیگی ہوئی تھی کہ اس نے انیس کی بات نہ سنی اور اپنی ہی دھن میں بولتی رہی۔ پھر ہماری جنت میں سانپ آ گھسا۔

وہ ان کا دوست تھا۔ اسے بازار والیوں سے شاید نفرت تھی۔

انیس نے لمبی آہ بھری۔ شاید اس لئے کہ اسے پتہ نہ تھا کہ عورت بائی کی کنی میں بندھی ہوتی ہے۔

وہ کبھی میرے سامنے نہ آیا تھا۔ جو ایک بار مجھ سے مل لیتا تو شاید اسے بھی مجھ پر ترس آ جاتا۔ شاید۔ اس نے آہ بھری۔

سولھویں دن وہ آیا۔ اس نے نیچے سے آواز دی۔ میں نے کہا اسے اوپر بلالو۔

نہیں۔ وہ نہیں آئے گا۔ میں اس کی بات سن لوں۔ ابھی آیا۔ وہ بولے۔ اور چلے گئے۔

میں بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہی۔ دن گزر گیا، ہفتہ گزر گیا، مہینا گزر گیا لیکن وہ نہ آئے۔

اگر وہ لوٹ آتے تو میں کچھ دن اور جی لیتی۔ چلو۔ وہ آہ بھر کر بولی۔ پندرہ دن ہی سہی۔

پندرہ دن بھی بہت ہوتے ہیں۔ میرے اللہ کی کرم نوازی ہے کہ مجھے پندرہ دن عطا کر دیئے۔ اسکی آواز کانپی۔ آنکھوں میں پھوار اڑی۔

انیس اٹھ بیٹھا اور مضطربانہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بولا شاید وہ اپنے دوست کا بھلا چاہتا ہو۔

وہ مسکرائی۔ بھلا چاہنے کے پردے میں کیا کیا خود غرضیاں چھپی ہوتی ہیں۔ کون جانے شاید۔ وہ حسد کا مارا ہوا تھا۔ ساوتی رک گئی۔

آپ کو تکلیف تو ہو گی۔ وہ بولی۔ مجھے ایک گلاس پانی کا دیجئے۔ انیس نے جگ سے گلاس بھرا۔

وہ بولے گئی۔ مجھے انہوں نے خود بتایا تھا کہ وہ چھانگلا ہے۔ چھانگلا بڑا حاسد ہوتا ہے۔

انیس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر گیا۔ اس نے فٹ سے اپنا ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔

باہر ہوا درختوں سے لپٹ لپٹ کر کراہ رہی تھی۔

شاخیں ایک دوسری کے کندھے پر سر رکھ کر آہیں بھر رہی تھیں۔ پتے آنسو بہا رہے تھے۔

دکھن دکھن

لڑکیوں کا آخری ٹولہ کٹیا سے نکلا۔ ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے کتر کتر کر باتیں کر رہی تھیں۔ شوخیاں کر رہی تھیں۔ فضا ان کے قہقہوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپوری تھیں۔ لگتا تھا جیسے دکھ درد سے قطعی طور پر ناواقف ہوں۔ لیکن جب وہ باری باری ہاتھ دکھانے کے لئے اکیلے میں جگن جوتشی سے ملتی تھیں تو دکھ سے بھیگی ہوتیں۔

ایک آہ بھر کر کہتی۔ جوتشی جی دیکھو تو میرا بیاہ ہوگا یا زندگی یونہی اکیلے میں بسر ہوگی۔ دوسری کہتی۔ کیا وہ مجھے مل جائے گا جسے میں چاہتی ہوں۔ کوئی اپنے مجازی خدا کی بے وفائی کی کتھا سناتی. کوئی ظالم سماج کا رونا روتی. کوئی سخت ماں باپ کا۔

جگن جوتشی سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ مل بیٹھتی میں تو زندگی شوخی سے بھرپور ہوتی ہے لیکن اکیلے میں دکھ سے چور چور۔ یہ کیا بھید ہے۔ سوچتے سوچتے وہ کٹیا سے باہر نکل آیا۔

سامنے بینچ پر بنواری بیٹھا تھا۔ ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑے. گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ارے یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ تو جذبے کا غلام ہے۔ اسے سوچ سے کیا واسطہ۔

پندرہ بیس دنوں کی بات ہے کہ بنواری اپنی قسمت کا حال جاننے کے لئے جگن جوتشی کی کٹیا میں آیا تھا۔ اس نے ایک انوکھا سوال پوچھا تھا۔ کہنے لگا۔ جوتشی جی میرا ہاتھ دیکھ کر یہ بتاؤ کیا مجھے کوئی ایسی زنانی ملے گی جو جیسی دکھتی ہو ویسی ہی ہو۔ میں اس زنانی کی ڈھونڈ میں ہوں۔ اس سوال پر جگن حیران ہوا۔ ایسی بات تو کسی نے کبھی پوچھی نہ تھی۔ جگن نے غور سے بنواری کا جائزہ لیا۔

وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ لیکن اسکا حسن پوری طرح سے دکھتا نہ تھا۔ بن ٹھن سے بے

نیاز. منہ ان دھلا. بال بکھرے ہوئے. موٹا لباس
جگن جوتشی کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس گاہک سے کیسے نپٹا جائے اس نے سوچا کہ کنفیوزڈ آدمی ہے۔ اسے مزید کنفیوز کر دوں تو شاید بات بن جائے۔ بولا۔ پہلے یہ بتا کہ تیرے دیکھن میں خرابی ہے یا اسکے دکھن میں۔
نہ نہ نہ۔ بنواری نے کہا۔ میرے دیکھن میں تو خرابی نہیں۔ میں عینک لگا کر نہیں دیکھتا۔ سارا جھگڑا زنانی کے دکھن کا ہے۔
جگن بولا۔ بھائی میرے دیکھن اور دکھن کھچڑی سمان نہیں ہوتے کہ دال الگ کر لو اور چاول الگ۔ وہ تو شربت سمان ہوتے ہیں۔ میٹھا اور پانی یوں گھل مل جاتے ہیں کہ الگ نہیں ہو سکتے۔ جگن نے اسے کنفیوز تو کیا مگر ساتھ بہلایا بھی جیسے ہر جوتشی پر گاہک کو بہلانا لازم ہوتا ہے۔ آخر میں جگن بولا۔ تجھے ایسی عورت ضرور ملے گی جو ویسی ہی ہو گی جیسی دکھے گی اور تم دونوں ہنسی خوشی دن گزارو گے۔
کب ملے گی؟ وہ بولا۔ میں تو پانچ سال سے گلیوں اور محلوں میں در بدر ہو رہا ہوں۔ لیکن آج تک نہیں ملی۔
مل جائے گی جلدی. مل جائے گی۔ جگن بولا۔ پر تو در بدر کیوں ہوتا ہے؟ یہاں آ بیٹھا کر۔ یہاں عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔
اچھا۔ بنواری بولا۔ پر یہاں بیٹھ کر کروں گا کیا؟
کرنا کیا ہے۔ در بدر ہو کر نہیں۔ بیٹھ کر ڈھونڈ۔ میرا بالکا بن جا۔ جو عورت آئے اس کا انٹرویو کر۔ اسے پوچھ کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ پھر اسکی پرچی بنا دے اور میں صرف اسے ملوں گا جس کے ہاتھ میں تیری دی ہوئی پرچی ہو گی۔
بنواری کی باچھیں کھل گئیں۔
جگن نے بات پکی کرنے کے لے کہا اور جس روز تجھے وہ مل جائے. بے شک لے جانا۔
بول تیری فیس کیا ہے۔ بنواری نے پوچھا۔
اونہوں۔ جگن بولا۔ کبھی بالکے سے بھی فیس لیا کرتے ہیں؟

عجیب آدمی ہے یہ۔ بنواری۔ جگن نے سوچا۔ پر یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جگن بنواری کے قریب جا بیٹھا۔ بولا۔ کس سوچ میں پڑا ہے تو۔ بنواری نے ٹھنڈی آہ بھری۔ بولا۔ اپنے نصیبے میں تو سوچیں ہی سوچیں ہیں۔

کیوں کیا پیسے کی تنگی ہے؟

نہیں جوتشی پیسہ تو بنواری کے ہاتھ کا میل ہے۔ جتنا چاہوں کما لوں۔ کل رات تین سو کمایا تھا۔

کیا کام کرتا ہے تو؟

چھابڑی لگاتا ہوں۔ دو گھنٹے میں سارا مال بک جاتا ہے۔ چاہے جتنا بناؤں۔ اللہ کا کچھ ایسا کرم ہے کہ گاہک انتظار کرتے ہیں کہ کب بنواری چھابڑی لگائے۔

کیا بناتا ہے تو؟ جگن نے پوچھا۔

پہلے کلفی بناتا تھا۔ پھر ایک رات خواب میں ایک بابا کو دیکھا۔ بابا نے کہا دیکھ بنواری وہ چیز نہ بنا جسکی مانگ گھٹ رہی ہے۔ وہ بنا جو فیشن میں ہے۔ میں نے کہا۔ کیا بناؤں۔ بابا بولا۔ تجھے خود پتہ لگ جائے گا۔ پھر پتہ لگا کیا؟ جگن نے پوچھا۔

بنواری بولا۔ اگلے دن جی اداس تھا؟۔ باہر جانے کا موڈ نہ تھا۔ ہل ٹاپ ہوٹل کا بیرا ادھر سے گزرا تو میں نے کہا یار کچھ کھانے کو بھیج دے لڑکے کے ہاتھ۔ باہر جانے کا موڈ نہیں ہے آج۔ تو اس نے برگر بھیج دیا۔ اسے کھانے لگا تو بابا کی بات یاد آ گئی۔ فٹ سے اسے کھول کر دیکھا کہ کیا کیا مصالحہ پڑا ہے اس میں۔ پھر ایک ہفتہ برگر بناتا رہا آزمانے کے لئے۔ پہلے روز چھابڑی لگائی تو گوروں کے بچوں نے بھیڑ لگا دی۔ ہوٹل والے ۲۰ روپے لیتے تھے میں نے دس کا لگا دیا۔ جوتشی۔ پیسے کے معاملے میں اللہ نے مجھے دین دے رکھی ہے کہ جتنا چاہے کما لے۔ پر کمائی کا فیدہ۔ جب گھر ہی نہ بنا تو کمائی کس کام کی۔

پر تو اتنا مایوس کیوں ہے؟ جگن نے پوچھا۔

تجھے نہیں پتہ جوتشی کہ میں وہ بوٹ ہوں جو آلنے سے گر پڑا ہے اور جو آلنے سے گرا وہ سدا رلے گا۔

یہ پہیلیاں کیوں بوجھوا رہا ہے مجھ سے۔ مجھے بتا کہ تیرے ساتھ کیا بیتی؟۔

کیا بتاؤں جوتشی۔ پہلا قدم ہی غلط پڑا۔ یوں سمجھ لے کہ پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی۔ اب

جو اس پر مینار بناؤں تو وہ ٹیڑھا ہی ہو گا نا۔
تجھے محبت ہو گئی کیا؟ جوتشی نے پوچھا۔
ہاں۔ بری طرح سے گھایل ہوا۔ پر میری بدقسمتی۔ ن زنانی سے گھایل ہوتا تو نپٹ لیتا کسی نا کسی طرح، پر وہ زنانی تو وجود ہی نہیں رکھتی سی۔
ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جگن بولا۔
ارے یہی تو ہوا۔ بنواری نے جواب دیا۔ وہ زنانی ناٹک میں جیتی تھی۔ جب تک ناٹک چلتا، وہ اٹھتی بیٹھتی، چلتی پھرتی، بولتی چالتی تھی۔ ناٹک ختم ہو جاتا تو ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو جاتی۔ پر جوتشی، میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔ میں سمجھا کہ جو لڑکی ناٹک میں کماری بنتی ہے۔ وہی کماری ہے۔ بس جی اس کے مکان کے پھیرے لیتا رہا۔ بڑا کھجل ہوا۔ بنواری چپ ہو گیا۔ دیر تک وہ بیتی ہوئی باتوں کو پھر سے بتیاتا رہا۔
جگن سمجھ گیا کہ بنواری پھوڑا بنا بیٹھا ہے۔ اسے چھیڑنا اچھا نہیں۔ جگن خود زخم خوردہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جوانی کی بھول کا زخم زندگی بھر رستا رہتا ہے اس لئے وہ بھی چپ بیٹھا رہا۔
صدیاں بیت گئیں
پھر بنواری نے سر اٹھایا۔ آہ بھر کر بولا۔
اگر وہ مجھے نہ ملتی تو اچھا ہوتا۔ ملی تو ایک ہی نظر میں پتہ چل گیا کہ وہ تو رنڈی ہے۔ کماری نہیں۔ اور رنڈی بھی دو ٹکے والی۔ مردار جسکے پنڈے پر گدھوں کی چونچوں کے نشان تھے۔ بس سمجھ میں آ گیا کہ کماری اور ہے روزی اور ہے۔ اور کماری تو وجود ہی نہیں رکھتی۔ اسے کسے ڈھونڈوں۔ وہ پھر خاموش ہو گیا۔
ٹیلے کے ارد گرد کی بتیاں بجھ گئی تھیں۔ ہوا چلنے لگی تھی۔ رات نے اپنا کالا تمبو تان لیا تھا۔ مال روڈ کی فیشن پریڈ ختم ہو چکی تھی۔
صدیاں بیت گئیں وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر بنواری نے سر اٹھایا اور اپنی ہی لگن میں گنگنانے لگا۔ پھر آہ بھر کر بولا۔ ناٹک میں کماری اک گیت گایا کرتی تھی۔

کاکھ لے گھر جاؤں

وہ اپنی بھدی مگر بھیگی آواز میں۔ مکھڑے کو گنگناتا رہا۔ بس یہ گیت جب وہ گاتی تو سمجھو میں مر جاتا تھا۔ روز ناٹک دیکھتا، روز مرتا۔ پھر اک دن ناٹک یہاں سے چلا گیا اور جاتے ہوئے

مجھے یہ بول دے گیا۔ دو سال میں یہ بول گنگناتا پھرا۔ پاگلوں کی طرح گلیوں میں۔
ایک دن جب میں تھک کر بنگلے کی ایک کھڑکی کے نیچے ستار رہا تھا تو کیا سنتا ہوں کہ بنگلے میں کوئی یہی بول گنگنا رہی ہے۔ سن کر میں تو پاگل ہو گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کماری میں جان پڑ گئی ہو۔
بنگلے کے چوکیدار سے ملا۔ پتہ چلا کہ بنگلے میں کوئی وڈیرا اور اس کی بیگم رہتے ہیں۔ میں نے چوکیدار کی منتیں کیں کہ ایک بار مجھے بیگم سے ملا دے۔ وہ نہ مانا۔ پھر میں نے اس کی مٹھی گرم کی اور وہ مان گیا۔
بیگم باہر دروازے پر آ گئی۔ غصے میں بولی۔ کون ہے تو اور کیا چاہتا ہے؟۔ میں نے کہا۔ بیگم صاحبہ. غصہ نہ کھائیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔ ابھی ابھی جو گیت آپ گنگنا رہی تھیں. میں اس گیت کا دیوانہ ہوں۔
پھر میں کیا کروں، وہ غصے میں بولی۔
جو تو کبھی کبھی یہ بول گنگنا دیا کرے تو میرا جیون سپھل ہو جائے۔ غصے میں وہ لوٹ جانے کے لئے مڑی تو میں نے منت کی۔ میں نے کہا۔ دیکھ میں بنگلے میں نہیں آؤں گا۔ باہر کھڑکی تلے بیٹھ کر سن لیا کروں گا۔ تیری مہربانی ہو گی۔ تو صرف اک بار گنگنا دیا کر روز کے روز۔ حسنہ نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ اسکا نام حسنہ تھا۔ پورا ایک ہفتہ میں نے اسکی کھڑکی کے نیچے بیٹھ کر گزار دیا۔ لیکن اس نے مجھے گھاس نہ ڈالی۔
بنواری نے لمبی آہ بھری۔ بولا۔ پھر اسے مجھ پر ترس آ گیا۔ ایک روز وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اور کاکھ لے گھر جاؤں. گنگنانے لگی۔ اتنا بھیگ کر گایا کہ میرا دل ڈوب گیا۔
پھر یوں ہوا کہ جب بھی میں وہاں پہنچتا۔ کھڑکی بجا دیتا اور وہ مجھے گیت سنا دیتی۔
پھر وہ کھڑکی کھول کر مجھ سے باتیں کرنے لگی اور ایک دن جب وڈیرا شہر سے باہر گیا ہوا تھا. اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ باتیں کرتی رہی۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ وہ بیگم نہیں ہے۔ وڈیرے نے اسے گھر ڈال رکھا ہے۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ جی چاہا کہ اسے کچھ دوں۔ دو دن شہر میں گھوم پھر کر میں نے اسکے لئے ایک ہار خریدا۔
ہار کو دیکھ کر حسنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی. نہ بنواری تو تو ایسے نہ کر جیسے دوسرے مرد کرتے ہیں۔ تو پہلا مرد ہے جس نے مجھے دیکھا نہیں۔ محسوس کیا ہے. جانا ہے.

تونے اس حسنہ کو جانا ہے جسے کسی مرد نے بھی نہیں جانا تھا۔ تونے تو مجھے یہ بات بھلادی ہے کہ میں بکاؤ مال ہوں۔ تو مجھے تحفے دیتا اچھا نہیں لگتا۔

جوتشی، بنواری بولا۔ دو مہینے ہم ملتے ہے، روز کے روز، وہ بھی کیا دن تھے۔ آہ بھر کر پھر خاموش ہو گیا۔

ایک دن وہ بڑے پیار سے کہنے لگی۔ بنواری، کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ تجھے مجھ میں کیا نظر آتا ہے؟

میں نے کہا، کچھ نظر آتا ہی ہے تو نثار ہو رہا ہوں۔

بولی، دیکھ بنواری، میں وہ نہیں ہوں جو تجھے دکھتی ہوں۔

میں نے کہا۔ کیوں نہیں ہے وہ۔ تو۔

بولی، صرف میں ہی نہیں۔ کوئی عورت بھی وہ نہیں ہے جو دکھتی ہے۔ پر کیوں؟ میں نے پوچھا۔

مجھے نہیں پتہ کیوں۔ عورت دکھن پر مجبور ہے۔ کوئی اس کے اندر لٹھ لئے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے دکھ۔ اکتائی ہوئی بیٹھی، خود کو نہ دکھانا چاہے۔ پھر بھی دکھنے پر مجبور کر دی جاتی ہے اور کلی بیٹھی ہو تو بھی زبردستی ہونٹوں پر مسکان آجاتی ہے

پھر جب وہ آخری بار مجھ سے ملی تو کہنے لگی، بنواری۔ تو واحد مرد ہے جو مرد بن کر مجھ سے نہیں ملا۔ مجھے دیکھن دکھن کے چکر میں نہیں ڈالا

میں نے کہا، دیکھ حسنی۔ میں نے اس روز پہلی بار اسے حسنی کہہ کر بلایا تھا۔ میں نے کہا حسنی میں نے کبھی تجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ میں تو آنکھیں بند کر کے تیرے پاس بیٹھ جاتا ہوں اور مجھے لگتا ہے جیسے میرے قریب کوئی ہے۔ کوئی میرا ساتھ دے رہی ہے۔ گھر پر بھی جب میں بیٹھتا ہوں تو تو ساتھ ہوتی ہے۔ میں تو کبھی اکیلا نہیں ہوا۔ ان دنوں جواب میں وہ بولی۔ بنواری، تو تو میری ہڈیوں میں بیٹھ گیا ہے۔ پتہ نہیں میں تیرے بغیر رہ بھی سکوں گی یا نہیں۔ اگر تو دیکھن دکھن کا چکر چلا دیتا تو۔ تو میری ہڈیوں میں نہ بیٹھتا۔

مجھے نہیں پتہ تھا کہ حسنی آخری بار مجھ سے مل رہی ہے۔ بنواری نے آہ بھر کر کہا۔ اگلے روز میں بنگلے پر گیا تو بنگلہ خالی پڑا تھا۔ پھر آوارہ پھرتے پھرتے میں تیرے پاس آیا۔ میں نے سوچا چلو جوتشی سے پوچھ دیکھو۔ تونے میرا حوصلہ بندھایا کہ وہ ضرور ملے گی۔ تو میں آس کی

دھونی رما کر یہاں بیٹھ گیا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔
دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔
دفعتاً جگن چلایا۔ نہیں، نہیں، نہیں، نہیں، جیسے اسے کسی نے زبردستی بولنے پر مجبور کر دیا ہو، بنواری چونکا۔ کیا نہیں؟
میں بھی وہ نہیں، جگن بولا۔ جو تجھے دکھتا ہوں۔ میں جوتشی نہیں ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں۔ میں نے تو جوتشی کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ میں تو لوگوں کو وہ کچھ بتاتا ہوں جو وہ سننا چاہتے ہیں۔ تیرا دل رکھنے کے لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ تجھے ضرور ملے گی۔ یہ سن کر بنواری کو دھچکا لگا۔ بولا جو یہ بات ہے تو میں یہاں کس آس پر بیٹھا ہوں۔
میں بھی خود سے یہی سوال پوچھا کرتا ہوں کہ جگن جی تم یہاں کس آس پر بیٹھے ہو۔ جگن نے کہا۔ مجھے اس سوال کا کبھی جواب نہیں ملا۔ لگتا ہے ہم سب آس کی دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس دھوئیں سے کچھ بر آمد نہیں ہو گا۔ پھر بھی بیٹھے ہیں۔ جگن نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی کہانی سنانے لگا۔ بولا۔ بنواری میں بھی دکھن دیکھیں کا مارا ہوا ہوں۔
اسے دیکھتے ہی میں تن من دھن سے اسکا ہو گیا۔ وہ بھی میری ہو گئی۔ ہم روز ملتے تھے۔ ایک سال کے بعد اس نے میری بات مان لی۔ وہ میری ہو گئی۔ ہم نے بیاہ کر لیا۔ ایک سال ہم اکٹھے رہے۔ یوں رہے جیسے دو بچے مل کر کھیلتے ہیں۔
پھر ایک دن وہ مجھے چھوڑ کر دوجے کے ساتھ چلی گئی۔ پیچھے ایک رقعہ چھوڑ گئی۔ لکھا تھا.
اب میں نے جانا ہے کہ تو وہ نہیں ہے جو دکھتا تھا۔ میں نے دیکھیں میں بھول کی۔ میں جا رہی ہوں۔ میرا پیچھا نہ کرنا۔ جگن خاموش ہو گیا۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر جگن نے بات شروع کی۔ بولا۔ ماں نے کہا۔ بیٹے. میں تیرا دوجا بیاہ کر دیتی ہوں۔ گھر بسا کر بیٹھ جا۔ میں نے کہا. نہیں۔ ماں. میرا دل ٹھکانے پر نہیں رہا۔ مجھے جانے دے۔ آوارہ پھروں گا تو شاید دل ٹھکانے لگ جائے۔ پھر گاؤں کا بابا فقیرا آ گیا۔ ماں نے اسے ساری بات سنائی. کہنے لگی. بابا۔ اسے سمجھا کہ یہ بیاہ کر لے۔ گھر بسا لے در بدر نہ پھرے۔

بابا فقیرا نے ساری بات سن کر سر جھکا لیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ نہ بی بی اسے نہ روک۔ اسے جانے دے۔ شاید باہر جا کر پھر دیکھن دکھن کے چکر میں پھنس جائے۔ جب تک یہ دیکھن دکھن کے چکر میں نہیں پھنسے گا، آباد نہیں ہو گا۔

بابا۔ میں نے پوچھا یہ دیکھن دکھن کا چکر ہے ؟

بولا۔ پتر یہ دیکھن دکھن کا چکر اک پردہ ہے۔

پردہ، کس کا پردہ ؟

بولا پتر وہ جو ڈال ڈال پات پات میں دکھتا ہے، جو ذرے ذرے میں دکھتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ ہم اسے دیکھیں، اس لئے اس نے ہمیں دیکھن دکھن کے چکر میں ڈال رکھا ہے کہ ہمارا دھیان ادھر لگا رہے ادھر نہ جائے۔

اور جس کا دھیان دیکھن دکھن کے چکر سے نکل جائے اسے ہوتا ہے بابا؟۔

جو دیکھن دکھن کے چکر سے نکل جاو تو پھر کچھ بھی نہیں رہتا۔ نہ میں رہتا ہے نہ تو۔ نہ دکھ نہ سکھ، نہ روشنی نہ اندھیرا، کچھ بھی نہیں رہتا۔ صرف وہ رہ جاتا ہے۔ صرف وہ۔ جگن کی بات سن کر بنواری کی گردن لٹک گئی۔ اسے ایسے لگا جیسے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ کچھ بھی نہیں۔

عین اس وقت روشنی کی اک کرن چمکی۔ کوئی آ رہا تھا۔ اسکے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔

بنگلے کا چوکیدار بنواری کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بولا۔ یہ تجھے شام سے ڈھونڈ رہی ہے۔

حسنہ بنواری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ بنواری۔ میں آ گئی۔ آئے بغیر رہا نہ گیا۔ مجبور ہو گئی۔ اب تو جان نہ جان۔ وہ بینچ پر بیٹھ گئی۔ بولی۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ نہ جا۔

کیوں؟ بنواری نے پوچھا۔

حسنہ نے اپنا سر بنواری کے کندھے پر رکھ دیا اور گنگنانے لگی۔

کا مکھ لے گھر جاؤں

اس کی آواز میں اتنی بھیگ تھی کہ یوں لگا جیسے ٹیلے پر بوندیاں برس رہی ہوں۔

چوہا

اس بنے سجے آرام دہ کمرے میں ہم دو تھے۔ لیکن دونوں ہی اکیلے، تنہا۔ اگر ہم دونوں اکیلے اکیلے ہوتے تو یقیناً اس قدر اکیلے نہ ہوتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ بہت دور۔ وہ مجھ سے بیزار تھی، میں اس سے بیزار تھا۔ چالیس سال ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے تھے۔

چالیس سال پہلے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی، عشق تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر دم نکلتا تھا۔ مجھے ایک فکر دامن گیر تھی اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں کیا کروں گا۔ اسے ایک غم تھا۔ اگر ٹاپ نہ ہوا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ خوش قسمتی سے بات بن گئی۔ ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔ پھر کئی ایک سال ہم محبت میں لت پت رہے۔ لت پت۔ وہ میرے لئے جیتی تھی۔ میں اس کے لئے جیتا تھا۔

پھر پتہ نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ اسے پتہ چلتا گیا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتی تھی کہ ہوں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر انکشاف ہوتا رہا کہ اس کی کچھ عادتیں ناقابل برداشت ہیں۔ پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔ کئی ایک سال ہم ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے۔ لڑتے جھگڑتے رہے۔ یہ صورت حال اس قدر بڑھ گئی کہ لڑنے جھگڑنے کے سوا ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سروکار نہ رہا۔

اور اب، اب ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لڑ لڑ، جھگڑ جھگڑ کر تھک گئے ہیں۔ اب اتنا تعلق بھی نہیں رہا کہ ایک دوسرے سے لڑیں جھگڑیں اب ہم ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں۔ وہ مجھے گوارا کر رہی ہے۔ مجبوراً میں اسے گوارا کر رہا ہوں۔ مجبوراً۔ وہ کہتی ہے۔ اس کا تو دماغ خراب ہے۔ یہ سمجھے گا۔ میں کہتا ہوں، اس کا تو دماغ سرے سے ہے ہی نہیں۔ سمجھانے کی کوشش عبث ہے۔

یوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ لیکن ایک دوسرے سے دور گاؤں کی حویلی میں بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

میرے پاس اسے کہنے کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کی روا دار نہ تھی۔ دن میں دو ایک بار بات کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ وہ آلو چھیلتے ہوئے چاقو سے مخاطب ہو کر کہتی، آلو میں بینگن ڈال لوں۔ میں شیو کرتے ہوئے استرے سے کہتا، ڈال لو۔ اکثر بولنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ بات اشاروں کی مدد سے ہو جاتی۔ وہ بن بولے سمجھا دیتی۔ میں بن کہے سمجھا دیتا۔

اب جب سے ہم دونوں کراچی اپنے بیٹے سکندر کے گھر آئے ہیں۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ چپ چاپ اپنے بستر پر بیٹھ کر کھڑکی کو گھورتی رہتی ہے۔ میں کرسی میں بیٹھ کر نیچے سڑک پر چلنے والی ٹریفک کو دیکھتا رہتا ہوں۔ کتنا سکون ہے، کتنا اطمینان ہے۔ کسے را باکسے کارے نہ باشد۔

پہلے ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ تھی تو حویلی لیکن سال ہا سال سے مرمت نہیں ہوئی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ سکندر سے کئی بار مرمت کے لئے کہا۔ اس نے پرواہ نہ کی۔ بات ٹال دی۔ سکندر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ گاؤں میں زیادہ دیر نہیں رہا۔ پہلے شہر میں پڑھنے کے لئے بورڈنگ میں رہا پھر بڑا افسر بن گیا۔ بیوی بھی شہر کی ملی۔ اس نے ہم سے پوچھے بنا خود ڈھونڈلی جیسے میں نے ڈھونڈلی تھی اور اب اس کی محبت میں لت پت ہو رہا ہے جس طرح میں ہوا تھا۔ سکندر اور اس کی بیوی دونوں کراچ میں صاحبوں کی طرح ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ بال بچہ ہے نہیں۔ بس ایک دوسرے میں ہی ڈوبے رہتے ہیں۔

گاؤں کی حویلی کے مغربی حصے کے تین کمرے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہاں ہم دونوں رہتے تھے۔ گاؤں سے ذرا فاصلے پر، شور شرابے سے دور حویلی سے سو پچاس قدم پر سائیں دروٹ کا مزار تھا۔ ہماری کھڑکیوں سے صاف نظر آتا تھا۔ انہیں سائیں چپ شاہ بھی کہتے ہیں۔

مشہور ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی سے بات نہیں کی تھی۔ بس اشاروں سے ہی بات کہہ دیتے تھے۔ میں پیروں فقیروں کی نہیں مانتا۔ لیکن دو ایک بار میں اتا پتا لگانے کے لئے مزار پر گیا تھا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ سائیں جی کا اصل نام۔ دڑ۔ وٹ تھا۔ جو غلط العام ہو کر دروٹ بن گیا۔ سائیں جی نے عمر بھر دڑوٹی رکھی تھی۔ یہ جان کر مجھے سائیں جی سے دلچسپی ہو گئی۔ اس لئے کہ ہم بھی سائیں جی کی طرح دڑ۔ وٹی۔ زندگی بسر کر رہے

تھے۔

مزار پر ایک شخص باقاعدہ حاضری دیتا تھا۔ اور جھاڑ پونچھ میں لگا رہتا تھا۔ اس کا نام فضلا تھا۔ فضلا شہر میں رہتا تھا۔ مگر جب بھی چھٹی ملتی مزار کی طرف چل پڑتا۔ مجھے فضلے پر بڑا ترس آتا ہے۔ بے چارا احمق خواہ مخواہ سائیں کی لگن لگائے بیٹھا ہے۔

پھر ہم دونوں۔ میں اور میری بیوی میں چوہے کی بات چل نکلی۔ ایسی چلی، ایسی چلی کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ پتہ نہیں کیا، ہوا، نہ وہ، وہ رہی نہ میں، میں رہا۔ چوہے کی بات ابھی چل ہی رہی تھی کہ سکندر آ گیا اور وہ ہمیں زبردستی کراچی لے آیا۔

کراچی میں تین چار ہفتے تو ہم جگہیں دیکھنے میں مصروف رہے۔ ہوا بندر، منگو پیر، کیماڑی اور پتہ نہیں کیا کیا۔ لیکن آخر جگہیں ختم ہو گئیں اور ہم اس بنی بجی انڈے کی طرح چمکتی ہوئی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

سکندر اور اس کی بیگم صبح اپنے اپنے دفتر چلے جاتے شام کو کوئی پارٹی یا ڈنر ہوتا۔ گھر میں صرف ہم ہوتے یا نوکر ہوتے۔

پھر وہ بنی بجی تنہائی کھلنے لگتی۔ وہ کمرے کی سجاوٹ، وہ آرام زدہ صبح و شام، وہ تکلف وہ رکھ رکھاؤ، وہ سب کچھ اک بوجھ بن جاتا۔ دم گھٹنے لگتا، گاؤں میں یہ بات نہ تھی۔ وہاں تنہائی تو تھی پر دم نہیں گھٹتا تھا۔ وہاں ہم دونوں اس قدر اکیلے نہ تھے۔ بے زاری اتنی گاڑھی نہ تھی۔

گاؤں میں وہ میرے لئے چائے بناتی تھی۔ کھانا پکاتی تھی، میں کبھی کبھار بازار سے سودا لے آتا۔ کراچی میں نہ کھانا پکانے کی بات تھی نہ سودا لانے کی۔ اس لئے ہم ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ میں سارا دن برآمدے میں بیٹھ کر نیچے چلتی ہوئی شاہراہ کا نظارہ کرتا رہتا۔ وہ پتہ نہیں اندر بیٹھی کیا کرتی رہتی۔

ایک دن جب میں سڑک کا نظارہ کر رہا تھا تو اس کی آواز سنائی دی۔ بولی شہروں میں چوہے نہیں ہوتے کیا۔ میں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ ٹائیلوں کے فرش پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی جیسے مجھ سے نہیں بلکہ ان سے پوچھ رہی ہو۔

چوہے کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ لو یہاں بھی چوہا آ پہنچا۔ کتنی مشکل سے گاؤں میں اس سے جان چھڑائی تھی۔

ہوتے ہوں گے۔ میں نے سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر اس کی آواز آئی۔ یہاں تو چوہا نہیں آیا کوئی۔

یہاں نہیں آیا تو میں کیا کروں۔ یہ کیا میرا قصور ہے۔ مجھے غصہ آگیا۔ مڑ کر دیکھا۔ عابدہ گملے پر جھکی ہوئی تھی یوں جیسے یہ سوال اس نے گملے سے کیا ہو۔

میں نے اپنے سلیپر کو مخاطب کر کے کہا۔ چوہا یہاں ٹائیلوں میں بل کیسے بنائے۔

کمرے میں دیر تک خاموشی طاری رہی۔

پھر وہ چھت سے مخاطب ہو کر بولی۔ بے شک بل نہ بنائے پر آئے تو سہی۔

اس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اس عورت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ جب گاؤں میں تھی تو کہتی تھی چوہا کیوں آتا ہے۔ اب کہہ رہی ہے چوہا کیوں نہیں آتا۔

گاؤں میں چوہے کی بات اچانک چل پڑی تھی۔ ہوا یوں کہ گاؤں میں ایک رات میں جاگا تو دیکھا کہ عابدہ چارپائی پر گٹھڑی بن کر بیٹھی ہے۔ میں نے سوچا چلو بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔ پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

کیا ہوا. میں نے پوچھا۔

خوف زدہ آوز میں بولی۔ چوہا ہے۔

اس پر مجھے غصہ آگیا۔ چوہا ہے تو پڑا ہو۔ گاؤں میں چوہا تو ہو گا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ رضائی لی اور پھر سے سو گیا۔

دوبارہ جاگا تو دیکھا کہ وہ جوں کی توں بیٹھی ہے۔

سوتی کیوں نہیں۔ میں نے کہا۔

نیند نہیں آتی۔

کیوں نہیں آتی؟

ڈر لگتا ہے۔

ڈر کیسا؟

چوہا جو ہے۔

کیا کرے گا چوہا؟

کاٹ لے گا۔

لاحول ولاقوت۔ یہ محترمہ سمجھتی ہے کہ اس کا گوشت اس قدر لذیذ ہے کہ چوہا اسے کاٹنے کے لئے اتنی دور سے چل کر آیا ہے۔

اگلے روز اس نے مجھے ایک سوراخ دکھایا، کہنے لگی۔ چوہا یہاں سے آتا ہے۔ میں نے اس سوراخ کے مطابق ایک پتھر تلاش کیا اور ہتھوڑے سے پتھر کو اس سوراخ میں ٹھونک دیا۔ لو میں نے اسے مخاطب کئے بغیر کہا۔ اب چوہا، نہیں آئے گا۔

رات کو اس نے مجھے جگا دیا۔ بولی چوہا تو آیا ہوا ہے۔ ذرا سنو تو۔

میں نے سنا۔ واقعی ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔

اگلے دن اس نے ایک اور سوراخ ڈھونڈ لیا بولی، یہاں سے آتا ہے۔ آٹھ دس دن ہم سوراخ ڈھونڈتے اور بند کرتے رہے۔ اس کے باوجود چوہا آتا رہا۔

پھر میں نے ایک ترکیب سوچی۔ میں نے کہا۔ دیکھ چوہا تجھے کاٹنے کے لئے نہیں آتا بلکہ کچھ کھانے کے لئے آتا ہے۔ اگر ڈیوڑھی میں کھانے کے لئے کوئی چیز رکھ دی جائے تو وہ نہ تو باورچی خانے میں جائے گا نہ ہمارے کمرے میں آئے گا۔

اس نے میری بات مان لی۔ دو تین دن وہ سارے گھر میں بڑ بڑ کرتی پھری۔ چوہا کون سی چیز خوشی سے کھاتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ چوہا کیا کھاتا ہے اس لئے میں خاموش رہا۔ تیسرے دن پتہ نہیں وہ کہاں سے سن آئی کہ چوہا پنیر بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ روز وہ رومال میں دہی باندھ کر لٹکا دیتی تا کہ شام تک پنیر تیار ہو جائے۔

اگلے روز صبح سویرے وہ دوڑی دوڑی آئی۔ بولی، چوہے نے سارا پنیر کھا لیا ہے۔ اس کے بعد جب بھی میں باہر نکلتا تو ڈیوڑھی میں چوہے کی تھالی کو غور سے دیکھتا کہ چوہے نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ رات کو آنکھ کھلتی تو کان لگا کر آواز سنتا رہتا کو چوہا ٹک ٹک کر رہا ہے یا نہیں۔

دس پندرہ دنوں کے بعد عابدہ منہ لٹکائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی، چوہا نہیں آیا۔

چوہا نہیں آیا؟ میرے منہ سے نکل گیا۔ کیوں نہیں آیا؟

دیکھ تو، وہ بولی۔ روٹی اور پنیر ویسے ہی پڑے ہیں تھالی میں۔

میں اٹھ کر ڈیوڑھی میں گیا۔ دیکھا تو چوہے کی تھالی پر ایک چڑیا بیٹھی ٹھونگے مار رہی

ہے۔ میں نے عابدہ کو آواز دی۔ یہ دیکھو چوہے کا پنیر چڑیا کھا رہی ہے۔

وہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی، بولی۔ کھانے دو بے چاری بھوکی ہے۔

اس کے بعد روز صبح عابدہ مجھے آواز دیتی۔ چوہا آج بھی نہیں آیا۔ انہی دنوں سکندر آ گیا اور زبردستی کراچی لے آیا۔

کراچی میں آنے کے بعد میں چوہے کو بالکل بھول چکا تھا۔ اس روز اچانک اس نے چوہے کی بات چھیڑ کر مجھے پریشان کر دیا۔ دراصل میں اس بات پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ گاؤں میں اس نے چوہے کی بات چلا کر مجھے احمق بنایا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چوہے کی بات کا جواب نہیں دوں گا۔

دو روز وہ کسی نہ کسی بہانے چوہے کی بات کرتی رہی مگر میں نے جواب نہ دیا۔

تیسرے دن واپس گاؤں جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ سکندر نے بڑی کی کوشش کی کہ وہ رک جائے لیکن وہ نہ مانی۔ اگلے روز ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔

راستے میں وہ بار بار اپنے آپ سے کہتی رہی۔ چوہا ہماری راہ دیکھ رہا ہو گا۔ لیکن میں نے جواب نہ دیا۔

اگلے روز ہم ریل گاڑی سے سٹیشن پر اترے جہاں سے تانگہ پر بیٹھ کر گاؤں جانا تھا۔ تو وہاں فضلا مل گیا۔

میں نے کہا۔ فضلے تو کہاں سے آ رہا ہے؟

وہ بولا۔ شہر سے آیا ہوں۔ سائیں جی کی حاضری دینے گاؤں جا رہا ہوں۔

میں نے کہا۔ فضلے تو سائیں درویش کو مانتا ہے کیا؟

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بولا۔ میں نے سائیں کو دیکھا ہی نہیں تو مانتا کیسا؟

پھر تو مزار پر حاضری کیوں دیتا ہے۔ باقاعدہ؟ میں نے پوچھا۔

اس میں ایک بھید ہے۔ وہ بولا۔

کیا بھید ہے؟ میں نے پوچھا۔

بس اتنا سا بھید ہے۔ فضلے نے کہا کہ دھیان خود سے ہٹا کر دوجے پر لگا دو چاہے وہ پیر ہو فقیر ہو یا چوہا ہو۔

چوہا ہو۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

ہاں وہ بولا۔ چاہے چوہا ہو اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ بولا آپ چلیں چوہدری جی۔ میں نذر نیاز لے کر گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

تانگہ چلنے لگا تو میں نے صوبہ تانگا والے سے کہا ذرا رک جا۔ اور پھر بے سوچے سمجھے بولا عابدہ۔

عابدہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کتنے سالوں بعد میں نے نام لے کر اسے بلایا تھا۔ میں نے کہا عابدہ. اس کے لئے کچھ لے جائیں یہاں سے۔

اس کی آنکھوں میں تبسم کی ایک لہر جھلکی۔ بولی، میں لے آئی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے تھیلے سے ولائتی پنیر کا ایک ڈبہ نکالا۔ اور فکر مند آواز سے بولی۔ سکندر کے ابا. وہ ولائتی پنیر کھالے گا کیا؟

بھور سمے

پیاری انو

دیکھو تو بھور سمے آ رہا ہے۔ دبے پاؤں۔ پگ، پگ، مدھم مدھم۔ پتہ نہیں کون، گوری پائل کی جھنکار کے بغیر، کس پیتم سے ملنے آ رہی ہے۔ دیکھو تو کیا مدھ بھری چال ہے، کیا چھب ہے۔

یہ بھور سمے بھی کیا سمے ہے انو۔ مہک میں رچا بسا ہوا، تازگی شگفتگی کی پھوار اڑاتا ہوا، مدھم دھڑکنوں سے بھرپور، بے نام سکون بکھیرتا ہوا دودھیا سویرا جیسے ماں کی گود کھل کھل کر دھرتی پر چھائے جا رہی ہو۔ جیسے اجابت دعا کے لئے اپنے مندر کے دوار کھول رہی ہو۔ جیسے اللہ میاں آکاش سے نیچے اتر آئے ہوں زیر لبی میں کہہ رہے ہوں، "بندے، آ مجھ سے باتیں کر۔"

کاش کہ تو یہاں ہوتی انو اور میرے پاس بیٹھ کر دیکھتی، ہم ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکٹھی دیکھتیں۔

صبح کے چار بجے ہیں انو، اور میں گھر کے باہر باغیچے میں بیٹھی تجھے خط لکھ رہی ہوں۔

گھر والے گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ رفیق پہل پہر یئے ہیں۔ رات دیر تک جاگتے ہیں۔ جوں جوں رات بھیگتی ہے ان کی حسیات جاگتی ہیں۔ پھر دو بجے کے قریب گویا غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ صبح دیر تک بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی بھور سمے نہیں دیکھا۔

میں پچھل پہری ہوں، جب پو پھوٹتی ہے تو مجھے جگا دیتی ہے۔ اٹھ صبو اٹھ دیکھ۔

میں کیا کیا دیکھوں انو، ہر طرف سے زیر لبی اٹھتی ہے، ادھر دیکھ ادھر، دیکھ دیکھ کر میں بوند بوند بھر جاتی ہوں پھر جی چاہتا ہے کوئی ہو جسے میں دکھاؤں اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکٹھے دیکھتے رہیں، دیکھتے رہیں۔

وہ دیکھ انو. پھول انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھے۔ سہمی سمٹی ہوئی بتیوں نے سبز چنیاں اوڑھ لیں۔ آنے والے سمے کے سواگت کے لئے۔

دیکھ انو دیکھ۔ کھگوں نے بوہے کھول دیئے۔ مکھیاں نکل آئیں۔ پھولوں نے سفید لباس اوڑھ لئے کہ مکھیاں دیکھ لیں۔ مکھیوں کا پریم سندیس بن کر اپنی سونا بھری کٹوریوں کے سرپوش اتار دیئے۔

لو ہوا جھولنے اٹھائے آ گئی کہ بھور سمے کو جھولن سمے بنا دے۔ انو ایک ایسا ہی بھور سمے میرے اندر چھایا ہوا ہے۔ دل کے انگ انگ میں رچا بسا ہوا ہے میرا جی چاہتا ہے کوئی اندر جھانکے، دیکھے، جانے۔ اس آرزو نے مجھے اکیلی کر دیا ہے انو۔ اکیلی تنہا۔ اک میں ہی نہیں انو تو بھی اکیلی ہے۔ ہم سب اکیساں ہیں۔ کوئی جان لیتی ہے کہ اکیلی ہوں۔ کوئی نہیں جانتی۔ کوئی سمجھ لیتی ہے کہ یہی ہمارا مقدر ہے۔ کوئی نہیں سمجھتی کیوں سمجھے۔ کیوں خود کو دکھی کرے۔ پر سمجھنے نہ سمجھنے سے مقدر نہیں بدلتے انو۔

پتا نہیں یہ بھور سمے دیکھن کب دبے پاؤں میرے اندر آ بسا جیسے دریا نیچے ہی نیچے سے آتا ہے۔ اور پھر "سیما" بن کر باہر نکل آتا ہے۔ اس "سیما" نے مجھے بھگو دیا۔ ڈبو دیا۔ اب میں نے جانا ہے انو کہ یہ دیکھن باہر سے نہیں آیا۔ اندر سے پھوٹا ہے۔ اب میں نے جانا ہے کہ یہ دیکھن عورت کا بھید ہے۔ پہلے دبا دبا بیٹھ رہتا ہے پھر ہولے ہولے نکلتا ہے، چھا جاتا ہے۔

جب میں جوان ہوئی تھی تو ایک دم مجھ پر دکھن کا جنون طاری ہوا تھا۔ میں دکھوں، روشنیوں میں دکھوں، اندھیرے میں دکھوں، بیٹھی ہوئی دکھوں، چلوں تو دکھوں، بولوں تو دکھوں، جھرمٹ میں دکھوں، اکیلے میں دکھوں۔ ایسی دکھوں کہ دوجا چونک جائے۔ انو میں دکھنے کی اتنی دیوانی ہوئی کہ بار بار دیکھتی کیسی دکھتی ہوں۔

میں سمجھی عورت کے جیون کا مقصد صرف دکھنا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ دکھنا تو پہل جوانی کا ایک پڑاؤ ہے منزل نہیں، چار سال میں دکھتی رہی۔

توبہ ایسی جوانی آئی کہ جو بھی سامنے آتا جوتوں میں کھڑا حیرت سے دیکھتا۔ جو گزر جاتا مڑ مڑ کر دیکھتا۔ جو بات کرنے کے لئے آتا بات بھول بھول جاتا۔ انو تو تو جانتی ہے کہ نگاہوں کی گود میں ایک جھولن ہوتا ہے۔ میں اس جھولنے پر ایسی چڑھی کہ سدھ بدھ کھو

بیٹھی، چار سال ہلاروں میں جیتی رہی۔
پھر رفیق آ گئے۔ رفیق میرے کزن ہیں۔ ولایت پڑھ گئے ہوئے تھے۔ مجھ دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ کئی ایک دن بے پتوار کی ناؤں کی طرح ڈولتے رہے۔ ڈگمگاتے رہے۔ پھر انہوں نے نگاہوں کا ایسا تار باندھ دیا کہ میں ان جانے میں پروئی گئی۔ جھولن میں ایسی لے آ گئی کہ رنگ پیدا ہو گیا۔ اس کی بوندیوں کی پھوار اڑنے لگی۔ مجھے بھگو دیا۔ میں سمجھی یہی محبت ہے۔

پھر ہماری شادی ہو گئی۔

شادی ہو گئی تو پتا نہیں کیا ہوا۔ کچھ ہو گیا۔ آناً فاناً ہو گیا جیسے بھڑ پروانہ بن جائے۔ ساری دنیا ہی بدل گئی دکھن، دیکھن میں بدل گیا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر جینے لگی انہیں بت بنا لیا۔ خود بھینٹ بن گئی۔ ہر وقت آرتی اٹھائے رکھتی، پھول برساتی رہتی۔

پھر آہستہ آہستہ وہ بت پھیل کر گرد و پیش پر چھا گیا۔ ہر چیز میں انہیں دکھن لگی۔ پھولوں میں، پتیوں میں، بادلوں میں، ہوا کے جھونکوں میں، ہر جگہ ہر اور

انو وہ۔ میرے بند بند میں سما گئے اور میرے اندر بھور سے پیدا ہو گیا۔

میری ساری سہیلیاں کہتی ہیں صبو، تو بڑی خوش نصیب ہے۔ تجھے ان کی محبت حاصل ہے۔ دو سال میں بھی یہی سمجھتی رہی تھی۔ پھر جیسے میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ نہیں یہ تو محبت نہیں۔

ہماری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں۔ اب ان کی نگاہوں کا تار ٹوٹ چکا ہے۔ میں انہیں وقفوں سے دکھتی ہوں۔ لیکن جب دیکھتے ہیں، آنکھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ پھر ایک شرارہ اڑتا ہے۔ بھس میں آگ لگ جاتی ہے۔ اک بھانبڑ ابھرتا ہے جوالا مکھی جاگتا ہے۔ ان کی آغوش میں میرے اندر پھلجھڑیاں چلتی ہیں۔ گھنٹیاں بجتی ہیں۔ رنگ رس پچکاریاں چھوٹتی ہیں۔ پھر ایک ہوائی شوں کر کے چل جاتی ہے۔ وہ دھم سے زمین پر آ گرتے ہیں۔ یوں آنکھ کھل جاتی ہے جیسے خواب سے بیدار ہوتے ہوں۔ پھر میں انہیں نہیں دکھتی۔ ان کی وہ نگاہ سوئچ آف ہو جاتی ہے۔ میں پیش منظر سے پس منظر میں چلی جاتی ہوں لیکن

میری نگاہ میں وہ کبھی پس منظر میں نہیں جاتے۔ سدا پیش منظر میں رہتے ہیں۔

اب میں نے جانا ہے انو۔ یہ آگ اگن تو محبت نہیں یہ تو لگن کی شدت کو ختم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ خود کو دوجے سے الگ کرنے، محفوظ کر لینے کی اک چال ہے۔

مرد کے دل میں محبت کا بھور سے پیدا نہیں ہوتا۔ انو وہ تو جلا دیتا ہے۔ محبت تو بناتی ہے، بگاڑتی نہیں۔ یہ تو کپا لنڈھا دینے والی بات ہے۔ محبت تو پلی پلی جوڑن کا نام ہے۔ انگ انگ میں دیپ جلائے رکھنے کا نام ہے۔ ایسے دیپ جوان بجھ ہوں۔ ہلکی ہلکی لہروں کا نام ہے جو بند بند میں رواں دواں رہیں۔ جوار بھاٹے کا نام نہیں۔

اب مجھے یاد آتا ہے انو باجی کہا کرتی تھی صبو عورت سے دھوکہ ہوا ہے۔ مرد کا پریم تو جیون پیالی بھری رکھنے کے لئے قدرت کی اک چال ہے۔

اب میں نے جانا انو باجی سچ کہتی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ محبت کی دین تو صرف عورت کو ملی ہے۔ مرد تو خالی جوار بھاٹا ہے، سکندر ہے آتا ہے فتح کرتا ہے، چلا جاتا ہے۔ مرد تو انو مداری کا طوطا ہے۔ توپ چلاتا ہے اور پھر آرام سے بے تعلق جھولنے پر جا بیٹھتا ہے اور عورت اپنے بند بند میں ممتا کے دیپ جلائے بیٹھی رہتی ہے، بیٹھی رہتی ہے۔

نہیں انو نہیں۔ میں قدرت کی چال کے جال میں پھنسنے والا پنچھی نہیں بنوں گی۔ مجھے تو اک ساتھی چاہئے جس کے انگ انگ میں محبت کی بھیگ رچی بسی ہو۔ تار بندھا رہے۔ مدھم لہریں رواں دواں رہیں۔ بند بند میں دیپ جلتے رہیں۔ محبت بھرے دیپ جیسے بھور سمے میں جلتے ہیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے انو جیسے یہ بھور سمے، چاروں اور چھایا ہوا بھور سمے، سمے بنانے والے کا اپنے بندوں کے نام محبت بھرا پیغام ہے۔ اسے سو کے مت گنوا، اٹھ، اٹھ کر میرے ساتھ باتیں کر، محبت بھری باتیں۔

انو میرا جی چاہتا ہے کوئی ہو۔ جو میرے ساتھ بھور سمے کو دیکھے، اس کے پیغام کو سنے، اسے بیتے اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے دیکھتے رہیں، دیکھتے رہیں۔

تمہاری

صبو

بلیک پاٹ

آپ تو انہیں جانتے ہی ہوں گے۔ دونوں مون مارکیٹ میں گھومتے پھرتے ہیں۔ جواد اپنے چوکور چہرے پر اتنا بڑا کالا چشمہ لگائے ہوتا ہے۔ یوں سمٹا سمٹا جیسے کالے چشمے کی اوٹ میں چھپا بیٹھا ہو۔

ایون پونی ٹیل لٹکائے پھرتی ہے۔ سانولی سلونی، کھڑی کھڑی، اکڑی گردن، ابھری چھاتی نیچے ستواں ہی ستواں۔ ماتھے پر گھوری۔ ہٹو بچو کا انداز۔

جواد کا اتنا بڑا سکینر کٹ چہرہ ہے بھرے بھرے شانے۔ پہلوانی جسم، لیکن بیچارہ جھجھک کا مارا ہوا سمٹا سمٹا۔ سہما سہما۔ آنکھ اٹھا کر دیکھنے میں جھجھک، ہاتھ بڑھانے میں جھجھک، کچھ کرنے میں جھجھک، نہ کرنے میں جھجھک۔

ایون بڑی بے جھجھک ہے۔ اتنی بے جھجھک کہ راہ چلتے اس کی طرف دیکھنے میں خود کو مجبور پاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں پھر گھبرا کر نظریں جھکا لیتے ہیں۔ پھر مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں چوری چوری۔

پرانے زمانے میں لڑکی شرما کر لجا کر متوجہ کرتی تھی۔ ایون بے دھڑکی سے متوجہ کرتی ہے۔ لیکن جب وہ متوجہ ہو جاتے ہیں تو غصے میں گھورتی ہے۔ ہاو ڈیر یو۔

بہرحال وہ دونوں مون مارکیٹ میں گھومتے پھرتے ہیں۔ آگے آگے ایون، باادب با ملاحظہ ہوشیار پیچھے پیچھے جواد۔

مارکیٹ سے نکل کر وہ گرین ایونیو پر مڑ جاتے ہیں۔ گرین ایونیو گرین بھی ہے، ویران بھی، اندھیری بھی۔ یہ ایونیو کپلز کی ایونیو ہے جہاں پہنچ کر فاصلے مٹ جاتے ہیں۔

لیکن ایون اور جواد کا فاصلہ برقرار رہتا ہے۔ ان کے لئے مون مارکیٹ اور گرین ایونیو میں چنداں فرق نہیں۔ ایون کی پیشانی بدستور تیوری زدہ رہتی ہے۔ انداز میں ہٹو بچو جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ حالانکہ وہاں کوئی ہٹنے والا ہوتا ہے نہ بچنے والا۔

جواد کی جھجھک کچھ اور بڑھ کر گھٹن بن جاتی ہے اور بند بند جھن جھن کرنے لگتی ہے۔ یوں جیسے بلیک کافی کا پیالہ پی رکھا ہو۔ پھر وہ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مقصد بات کرنا نہیں ہوتا، پوچھنا نہیں ہوتا۔ جاننا نہیں ہوتا۔ قریب آنا نہیں ہوتا۔ صرف بولنا ہوتا ہے۔ تنہائی میں لوگ بولتے ہیں۔ خود سے بولتے ہیں تاکہ اپنی آواز سن کر حوصلہ ہو۔

وہ اٹک اٹک کر بولتا ہے۔

وہ فناک سے جواب دیتی ہے۔ نفی یا اثبات میں نہیں جواب خود ایک سوال ہوتا ہے۔

سوالیہ جواب دینا ماڈرن لڑکی کی ایجاد ہے۔ پرانے زمانے میں لڑکی خاموشی کے ذریعے جواب دیا کرتی تھی۔ آج کل سوال میں جواب دیتی ہے۔ پرانے زمانے میں مثل مشہور تھی کہ لڑکی کہے نہیں تو مطلب ہوتا ہے شاید۔ شاید کہے تو مطلب ہوتا ہے ہاں۔ اور اگر ہاں کہہ دے تو جان لو کہ وہ لڑکی نہیں کوئی اور جنس ہے۔

آج کل لڑکی نہیں کہے تو مطلب ہوتا ہے نہیں۔ شاید کہے تو مطلب ہوتا ہے شاید۔ ہاں کہے تو صاحبو جان لو کہ لڑکی ہی ہے کوا ور جنس نہیں۔

ضرب الامثال کتنی بدل گئی ہیں۔ محاورے نہیں چلتے. نہ دل باغ باغ ہوتا ہے نہ کوا مہمان کی خبر لاتا ہے، نہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ دودھ کا جلا تو دودھ بھی پھونک پھونک کر نہیں پیتا۔ چھاچھ کی بات چھوڑیئے۔ بہر حال جواد کے سوال بے معنی ہوتے ہیں۔ مبہم ہوتے ہیں۔

وہ پوچھتا ہے ریکس بار میں برگر کھاؤ گی؟

وہ کہتی ہے وہائی ناٹ۔

وہ کہتا ہے کل مینا بازار پر چلو گی؟

وہ کہتی ہے نہ جاؤں کیا؟

وہ کہتا ہے ڈیڈی ممی مان گئے کہ نہیں؟

وہ کہتی ہے کیا فرق پڑتا ہے؟

وہ کہتا ہے یہ کالی شال کتنی اچھی لگتی ہے۔

وہ کہتی ہے کیسے نہ لگے۔

چلتے چلتے وہ ڈیوس، سٹریٹ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ڈیوس سٹریٹ میں جواد کا گھر
ہے
گھر کے قریب جا کر وہ رک جاتی ہے۔
رکو گی۔ وہ پوچھتا ہے۔
وہاٹ فار۔ وہ منہ موڑے بغیر کہتی ہے پھر بائی کہ کر چل پڑتی ہے۔
وہ کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔
اسے ایسے لگتا ہے جیسے بلیک کافی سے بھری ہوئی پاٹ جا رہی ہو۔ اکڑی گردن
ابھری ٹونٹی اور نیچے ستواں ہی ستواں۔
منہ کھولے وہ یوں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے جیسے خالی پیالہ دھرا ہو۔
وہ چلے جاتی ہے۔ مڑ کر دیکھے بغیر چلے جاتی ہے۔
جواد کو حسرت ہے کہ وہ مڑ کر دیکھے۔
ایون سے پوچھو تو کہے گی کیا فرق پڑتا ہے۔
جواد کے لئے بڑا فرق پڑتا ہے۔
سبھی سمجھتے ہیں کہ ہاں فرق پڑتا ہے۔ اگر ایون مڑ کر دیکھے تو شاید جواد اتنی دیر بنگلے
کے گیٹ پر یوں نہ رکا رہے جیسے سامنے "انتظار کرو" کی تختی لگی ہو۔ شاید یہ سچ ہو
شاید یہ سچ ہو یا شاید ان کا ساتھ اسی لئے قائم ہو کہ وہ یک لفظی جواب دیتی ہے۔
فاصلہ قائم رکھتی ہے۔
ہٹو بچو کا آسن جمائے رہتی ہے۔ مڑ کر نہیں دیکھتی یا شاید اس لئے کہ جواد کو مڑ کر
دیکھنے والی سے سابقہ نہیں پڑا۔
دراصل دونوں ہی زندگی کی شاہراہ سے کٹے ہوئے ہیں۔ دونوں ویرانے میں رہتے
ہیں۔ امارت کے جزیرے کے راہنس ہیں۔ دونوں نے طوطے پال رکھے ہیں۔ ایک نے
ناک پر بٹھا رکھا ہے دوسرے نے بلیک پاٹ پر دونوں ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ دیدہ
زیب۔ ویل کیپٹ، سنسان ویران محلہ۔ جہاں دن کے وقت موٹریں بھونکتی ہیں، رات کو
اونچی ذات کے کتے جہاں جی صاحب کے سوا انسان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس بہشت میں
کوئی آزار نہیں، کسی کو کسی سے سروکار نہیں۔

ایون اونچے اہل کار کی بیٹی ہے۔ گھر بھی نک چڑھا، گھر والے بھی۔ دراصل اس کا نام ایمن تھا۔ گھر والوں نے ساؤنڈ ایفکٹ کی وجہ سے چنا تھا۔ انہیں کیا پتہ کہ ایمن کا مفہوم کیا ہے۔ راگ ہے یا راگنی۔ مفہوم جانو نہ جانو، سمجھو نہ سمجھو، نام اپنا رنگ جمائے بنا کب چھوڑتا ہے۔ جبھی ایمن میں سارے سر تیور لگ گئے۔ مدھم کی گنجائش نہ رہی۔ برہا بھی پھوٹ نکلا مگر جانا نہیں ان جانا۔

برہا جانا ہو تو منزل سامنے آ جاتی ہے۔ مقصود او جھل نہیں ہوتا۔ ان جانا ہو تو منزل نہ راستہ۔ بے کلی ہی بے کلی۔ بے نام بے کلی۔

پھر جب کالج میں ایمن نے عنفوان شباب کی پہلی انگڑائی لی تو لڑکوں نے شور مچا دیا ارے یہ ایمن نہیں یہ تو اے ون ہے۔

یوں وہ ایمن سے اے ون بن گئی۔

اے ون بن کر وہ اس قدر خوش ہوئی کہ اس نے وہ انگڑائی مستقل طور پر خود طاری کر لی۔ یوں وہ کھڑی کھڑی، تنی تنی بن گئی۔ اکڑی گردن ابھری چھاتی۔ نیچے ستواں ہی ستواں۔

پرانے معیار سے جانچا جائے تو وہ اے ون نہ تھی اگرچہ خدوخال کھڑے کھڑے تھے لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے نہ تھے۔ رنگ تھا تو گندمی مگر امریکی گندم سا میلا میلا۔ آنکھیں روشن تو تھیں مگر کچھ زیادہ ہی روشن تھیں اور ترت پھرت ایسی جیسے قدم تول کر رکھتی ہو مگر راستہ کھو بیٹھتی ہو۔

اس کی تمام ترکشش جسم میں تھی اور جسم تو حرص کا اندھا کنواں ہوتا ہے۔ جو گرا وہ پھر نہ ابھرا۔

پرانے زمانے میں حسن چہرے سے پھوٹتا تھا۔ ذات تک پہنچتا تھا۔ آج کل چہرے سے پھوٹتا ہے اور جسم میں دفن ہو کر رہ جاتا ہے۔

جواد اور ایون کا یہ بندھن شاید اس لئے تھا کہ جواد کو بلیک کافی سے لگاؤ تھا۔ بچپن ہی میں یہ لگاؤ عشق میں بدل گیا تھا۔ چونکہ بچپن میں ممی نے اس کے لئے بلیک کافی ممنوع کر دی تھی۔ اس کے سامنے ڈیڈی روز چار بار پیتے تھے۔

ممی خود اپنے ہاتھوں سے بناتی اور بلیک پاٹ میں ڈال کر خود ڈیڈی کے پاس لے

جاتی تھی اور وہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ وہ پاٹ بھی کیا پاٹ تھی۔ حبشی رنگ، کھڑی کھڑی اکڑی گردن، ابھری ٹونٹی اور نیچے ستواں ہی ستواں۔ بالکل ممی جیسی تنی تنی۔ ممی کے ہاتھ میں بلیک پاٹ ہوتی ڈیڈی کے سامنے خالی پیالہ دھرا ہوتا۔

ڈیڈی خالی پیالے کی طرح ہر وقت کرسی میں دھرے رہتے تھے ___ منتظر کہ کب ممی آئے اور بھر دے۔

بچپن سے جواد یہی منظر دیکھتا چلا آیا تھا۔

بیچارہ خود سالہا سال خالی پیالہ بنا بیٹھا رہا۔ منتظر کہ کب بندش ٹوٹے۔ کافی کی بندش کے خلاف احتجاجاً اس نے دودھ اور مٹھائی کے خلاف الرجی پال لی تھی۔

بی اے کرنے کے بعد جب بندرش ٹوٹی، پیالہ بھرا تو پہلے ہی گھونٹ نے اسے جھنجھنا کر رکھ دیا۔ پتہ نہیں یہ بلیک کافی کا مزا تھا یا بندش ٹوٹنے کا۔ کئی ایک دن وہ جھن جھن کرتا رہا۔

جواد کے لئے کافی بلیک پاٹ میں نہیں بنتی تھی۔ نہ ممی خود بنا کر لاتی۔ خانساماں ایک بھوری، بیٹھی بیٹھی بھدی چائے دانی سامنے دھر دیتا جس سے میٹھے دودھ کی بو آتی پھر بھی چلو بلیک کافی تو تھی۔ شاید کسی روز بلیک پاٹ میں میسر آ جائے ___ اور وہ آ گئی۔

ہوا یوں کہ ایک روز جب وہ اپنے دوست کے ساتھ بس سٹاپ پر کھڑا تھا تو دوست نے کسی لڑکی کو چھیڑا۔ معاً جواد کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ پڑا۔ وہ حیران رہ گیا پھر غصہ آیا یہ کیا بات ہوئی کہ کرے کوئی بھرے کوئی۔ اس نے بھنا کر اوپر دیکھا۔ سامنے وہ کھڑی تھی۔ سانولا رنگ. تنی تنی اکڑی گردن، ابھری ٹونٹی نیچے ستواں ہی ستواں۔

جواد جوں کا توں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

پھر یوں جھن جھن کرنے لگا جیسے بلیک پاٹ سے کافی پی کر آیا ہو۔ پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے مگر ایسے ہوتا ہے۔ اگر کوئی کسی کے منہ پر تھپڑ مار دے اور دوسرا بے بسی سے اسے دیکھے اور پھر آنکھیں جھکا لے تو دونوں کے درمیان ایک

بندھن بندھ جاتا ہے، اٹوٹ بندھن۔

پرانے زمانے میں مرد تھپڑ مارتا تھااور عورت بے بسی سے نگاہیں جھکالیتی تھی۔ آج کل لڑکی تھپڑ مارتی ہے اور لڑکا آنکھیں جھکا لیتا ہے۔ اگرچہ محرکات بدل گئے ہیں لیکن سچویشن میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اس واقعہ کے بعد جواد نے بہانے بہانے یوں ایون کے گھر آنا جانا شروع کر دیا جیسے وہ تھپڑ نہیں بلکہ آنے جانے کا دعوت نامہ تھا۔ البتہ ابتدائی دور میں وہ جب بھی ایون کے روبرو جاتا تو ان جانے میں گال پر ہاتھ رکھ لیتا جیسے اسے کسی خاموش محبت کی یاد دلا رہا ہو۔ اے ون یوں نارمل رہتی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میٹر آف فیکٹ انداز سے باتیں کرتی۔ جوا کلب چلو گے آج جوا چلو بار پر برگر کھائیں۔

اس واقعہ سے پہلے وہ سیدھا سادا جواد تھا۔ اپنے نام پر مطمئن تھا لیکن اے ون جب اسے جوا کہتی تو اس کی ایڑیاں ہوا میں اٹھ جاتیں۔ چھاتی تن جاتی جیسے وہ مرد بن گیا ہو۔ جوا کتنا مردانہ نام تھا۔ نانیٹ ایرٹ جیسا کھرا کھرا مردانہ وار۔ اس کے مقابلے میں جواد تو بالکل لیٹا لیٹا محسوس ہوتا تھا۔

اس ایک تھپڑ نے جواد کو جوا بنا دیا تھا۔

پھر ایک دن بلیو مارکیٹ میں گھومتے گھومتے گرین ایونیو کی طرف مڑنے کے بجائے وہ بس سٹاپ کی طرف چل پڑی۔ وہ حیران ہوا لیکن پیچھے پیچھے چلتا رہا، وہ رک گئی۔ وہ بھی رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ٹھٹکا یہ کیا ہوا۔ مڑ کر دیکھنا تو خارج از امکان تھا رے یہ بلیک پاٹ تو نہیں۔ یہ تو کوئی سفید چیک ہے جس کے پیچھے پیچھے میں چل رہا ہوں۔ یہ تو بھول ہو گئی۔ پر ہوئی کیسے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ قریب آگئی۔ وہ بھی رک گیا۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ای این کوارٹرز کہاں ہیں؟

"ای این کوارٹرز۔ ؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ہاں۔ میرے خیال میں ادھر ہی ہیں۔

"مجھے بتائیے پلیز میں ناواقف ہوں۔" سفید چیک بولی۔

لڑکی کی پیشانی فلیٹ تھی۔ کوئی تیوری نہ تھی۔ بے جان گالوں میں بھنور پڑ رہے تھے ہونٹ ادھ مسکراہٹ میں کھلے تھے۔۔

کتنی ان کلچرڈ ہے۔ اس نے سوچا۔ ان ڈگنی فائیڈ۔ خامخواہ مسکرائے جا رہی ہے۔ چیپ "ہاں ہاں آیئے" وہ بڑے پولایٹ لہجے میں بولا۔ ڈھونڈھ لیتے ہیں اور آگے آگے چل پڑا۔ دو ایک قدم چلنے کے بعد جواد نے آگے دیکھا۔ آگے کوئی بھی نہ تھا۔ جس کے پیچھے پیچھے وہ چلتا۔ وہ تو پیچھے پیچھے چلنے کا عادی تھا ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

پھر اسے یاد آیا کہ وہ پیچھے آ رہی ہے۔ مڑ کر دیکھا کچھ فاصلے پر وہ سہمی سمٹی آ رہی تھی۔

لڑکی کو احساس ہوا کہ وہ مڑ کر دیکھ رہا ہے تو مسرت کی پھوار سی اڑی۔ جواد کا منہ بھیگ گیا۔ اسے غصہ آ گیا۔ خوامخواہ اٹریکٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان لوئر مڈل کلاس لڑکیوں کی کسی ساعت بھولتا ہی نہیں کہ وہ لڑکیاں ہیں۔ ہر وقت ہونٹوں پر لڑکی کا بورڈ لگائے پھرتی ہے۔ ہاؤ چیپ۔

لڑکی کو متوجہ دیکھ کر اس نے سوچا کہ گڈ مینرز کا مطالبہ ہے کہ کوئی بات کروں۔ بولا آپ اس شہر سے واقف نہیں کیا۔

اونہوں۔ لڑکی نے ہونٹ نکال دیئے۔ فیصل آباد سے آئی ہوں بھائی کے پاس۔ وہ ای این کوارٹرز میں رہتے ہیں۔ ای این نمبر چھ۔

اوہ جواد نے شانے جھٹکے۔ لوئر مڈل کلاس چینل۔

یقیناً ادھر ہی ہیں۔ کبھی ادھر آیا ہی نہیں موقعہ نہیں ملا۔ وہ رک گیا۔ لڑکی قریب آ گئی۔ میں نے ناحق آپ کو تکلیف دی۔

اٹ از آل رائٹ۔ نو بادر۔

دفعتاً جواد نے محسوس کیا کہ وہ بڑی روانی سے بول رہا ہے۔ جیسے گھٹن ختم ہو گئی ہو اور وہ کھلے میدان میں آ گیا ہو۔ وی ول ٹرائی۔ اس نے شانے جھٹکے۔

جی۔ لڑکی نے سر جھکا لیا۔ گالوں پر رنگ جھلکا۔

خوامخواہ رنگ جھلکا رہی ہے۔ سلی فول۔ اس نے ناک چڑھائی اور آگے چل پڑا۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ آگے چل رہا ہے اور وہ پیچھے آ رہی ہے۔ اس

نے محسوس کیا۔ جیسے وہ خود اے ون ہو۔ ایک احساس برتری تن بدن پر چھا گیا۔ ماتھے پر تیوری چڑھ گئی۔ گردن اکڑ گئی۔ چھاتی تن گئی۔ یہ عجیب احساس تھا جس سے وہ قطعی ناواقف تھا۔

چار ایک ساعت کے لئے وہ دونوں چپ چاپ چلتے رہے پھر مہربانہ جذبے سے مغلوب ہو کر جواد بولا۔ آپ پڑھتی ہیں کیا؟

جی۔ جبھی تو یہاں داخلہ لینے آئی ہوں۔

کالج میں۔

جی نہیں۔ وہ بولی۔ یونیورسٹی میں۔

یونیورسٹی کا نام سن کر وہ چونکا۔ مڑ کر دیکھا۔

بیٹھی بیٹھی چینک سے دودھ کی پھوار اڑ رہی تھی۔

کسی کورس میں داخلہ لیں گی آپ؟

جی نہیں ففتھ ایر میں۔

ففتھ ایر، وہ گھبرا گیا۔

جی، ففتھ ایر۔

اگرچہ اس کی جی جی بڑی چیپ تھی لیکن اس کی جی جی سے اس کی اپنی حیثیت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ایڑیاں ہوا میں اٹھ جاتیں۔ چھاتی ابھر آتی۔ اس کی طبعی جھجک دور ہوئی جا رہی تھی جیسے سورج کے نکلنے پر اوس اڑ جاتی ہے۔

دفعتاً وہ اس ایریا میں داخل ہوئے جہاں کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ ایک فراخ گلی میں لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے اور بالکنوں میں لڑکیاں کھڑی تھیں۔ کوارٹروں کے دروازے کھلے تھے۔ اندر سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ گھبرا گیا۔

یہ رہائش گاہیں ہیں یا جمعہ بازار لگا ہے۔ اتنا شور۔

انہیں گلی میں داخل ہوتے دیکھ کر سب کی نگاہیں ان پر مرکوز ہو گئیں۔ لڑکوں نے کھیل روک لیا۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جواد از سر نو گھبرا گیا۔ لڑکی کھلاڑیوں سے اپنے بھائی کا پتہ پوچھ رہی تھی۔ بالکنوں میں تمام لڑکیوں کی نگاہیں جواد پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی ہیرو ہو۔

ارد گرد فینز کا جھمگھٹہ لگا ہو۔ مائی گاڈ۔ میں تو سلمز میں آ گیا۔ اس کے دل میں نفرت کا ایک ریلا اٹھا۔ گرد و پیش دھندلا گیا۔

پھر اسے یاد نہیں ایک دھندلکے میں وہ اس کے روبرو کھڑی ایک پلیٹ میں اسے گلاب جامن پیش کر رہی تھی۔ نو نو تو تھینک یو۔ وہ مٹھائی کو دیکھ کر ناک چڑھا رہا تھا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ سو کائنڈ آف یو سر۔ چیپ تبسم کی پھوار سے اس کا منہ گیلا ہو رہا تھا۔ ڈیش اِٹ اس نے غصے میں بل کھایا۔

جب وہ گھر پہنچا تو خانساماں اس کا منتظر تھا۔ غیر از معمول اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کافی صاحب، وہ بولا۔ تیار ہے صاحب۔ پھر وہ دوڑا دوڑا گیا اور ٹرالی لے آیا۔ بنا دوں، وہ بولا۔

نہیں میں خود بنا لوں گا۔

اس نے ٹرالی کی طرف دیکھا۔ سامنے بلیک پاٹ پڑی تھی۔ ارے وہ حیران رہ گیا۔ بلیک پاٹ۔ آج بلیک پاٹ کیسے آ گئی۔ حیرت سے کے علاوہ اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کواٹر کی ساری کوفت کافور ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا دفعتاً اس کی نگاہ پاٹ کے پیچھے جا پڑی۔ ایک پلیٹ میں مٹھائی رکھی ہوئی تھی۔ مٹھائی۔ اس نے تحقیر سے پلیٹ کی طرف دیکھا۔ یہ میڈیاکر چیز کیسے آ گئی۔ لیکن اس کا جی چاہ رہا تھا کہ گلاب جامن کھائے۔ ان جانے میں اس کا ہاتھ گلاب جامن کی طرف بڑھا۔

تراخ آواز آئی بلیک پاٹ فرش پر گر کر چور چور ہو گئی۔

افسر

معلوم نہیں یہ خوش قسمتی تھی یا بدنصیبی؟ کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔
بہرحال سبھی یک زبان ہو کر کہہ رہے تھے کہ قائم دین کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا ہے۔ خود قائم دین اور اس کی بیوی عائشہ بھی سمجھتے تھے۔ کیسے نہ سمجھتے۔ جب یہ واقعہ عمل میں آیا تھا تو رشتہ داروں اور دوستوں کی مبارک بادوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ قائم کی بیوی نے محلے میں لڈو بانٹے تھے۔ قائم دین کے اسنیک کارنر کے دوستوں نے اسے ایک شاندار پارٹی دی تھی۔

اسنیک کارنر سیکرٹریٹ کے باہر الگ تھلگ سرخ رنگ کی ایک منزلہ عمارت میں ایک سستی قسم کا چائے خانہ تھا۔ جہاں سیکرٹریٹ کے کلرک، اسسٹنٹ، اسٹینو، سپرنٹنڈنٹ اور دوسرے نچلے درجے کا اسٹاف اکٹھا ہوا کرتا تھا۔ جہاں لوگ چائے پینے کے بہانے دل ہلکا کرنے کے لئے آتے۔ پیالیوں کی اوٹ میں بات چل نکلتی۔ بات سے بات نکلتی، بڑھتی، حتیٰ کہ باتوں کا جھاڑ بندھ جاتا۔ پیالیاں ختم ہو جاتیں۔ پھر سے چلتیں۔ لیکن بات ختم نہ ہوتی۔

اسنیک کارنر میں حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا سرکار کے نئے اصلاحی اقدامات پر نکتہ چینی ہوتی۔ جدید ادب پر اظہار خیال ہوتا۔ لیکن یہ سب کچھ وقتی طور پر ہوتا۔ دیباچے کے طور پر، منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے یا وو ریفرنس ٹو دی کانٹیکسٹ۔ اسنیک کارنر کا اصل موضوع تو دفتریات تھا۔ دفتر انکشافات روٹیم کے چٹکلے، پی یو سی کی گتھیاں، افسروں کی مضحکہ خیزیاں، فائلوں کے راز ہائے دروں، نوٹوں کی خانہ حکیل وغیرہ۔

اب سب باتوں پر اسنیک کارنر میں ہر وقت رننگ کمنٹری چلتی تھی۔ صبح ہو یا شام۔ دفتر کا وقت ہو یا چھٹی کا دن، ہر وقت ایک نہ ایک ٹولہ اسنیک کارنر میں بیٹھا رہتا تھا۔
در اصل اسنیک کارنر سیکرٹریٹ کا سیفٹی والو تھا۔ جہاں ہر شخص دل کا بخار نکال سکتا تھا۔ اپنی قابلیت کی دھاک بٹھا سکتا تھا۔ اپنی انا کی تسکین کر سکتا تھا اور افسروں کی نالائقی۔

بے حسی اور لاعلمی کی کہانیاں سن یا سنا کر اپنی پسماندگی کی کمی پوری کر سکتا تھا۔

اسنیک کارنر میں ہر قسم کے لوگ آیا کرتے تھے۔ قابل، ذہین، محنتی لوگ اور ایسے بھی جو خالی زعم کی بیساکھیوں پر کھڑے تھے۔ بہر طور اسنیک کارنر میں آنے والے ہر فرد کو چاہے وہ لائق ہو یا نالائق یہ شکایت تھی کہ اس پر نالائق افسر فائز تھے۔

قائم دین کا ٹولہ دس بارہ کلرکوں پر مشتمل تھا۔ اس ٹولے میں چار افراد پیش پیش تھے۔ قیصر، زبیر، رفعت اور قائم۔

قیصر کو سارے سروس رولز ازبر تھے۔ اور انہیں برتنے میں ماہر تھا۔ جبھی تو سارے دفتر کے افسروں میں اس کی بڑی مانگ تھی۔

جب بھی کسی افسر کو کسی بے ضابطگی پر پردہ ڈالنے کی ضرورت پڑتی تو وہ قیصر کو بلا بھیجتا۔ کیس کو پڑھنے کے بعد اگر قیصر کہہ دیتا۔ سر فکر نہ کیجئے ہو جائے گا۔ تو سر کو تسلی ہو جاتی۔ عام طور پر بڑے بڑے مشکل اور پیچیدہ کیسوں پر بھی قیصر فاتحانہ انداز سے یہ فیصلہ دیتا۔ بڑی گنجائش ہے سر۔ اسی وجہ سے تو قیصر کی بڑی مانگ تھی۔

زبیر کو نوٹ لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ اس کمال کا انگریزی زبان سے تعلق نہ تھا بلکہ کیس کی پریزینٹیشن کا اعجاز تھا۔ مثلاً اگر زبیر چاہتا کہ منظوری مل جائے تو وہ نوٹ یوں لکھتا۔ اگرچہ اس کیس میں فلاں خرابی ہے، فلاں خرابی ہے، فلاں خرابی ہے لیکن قانون کی رو سے ہم اسے رد نہیں کر سکتے۔

اگر وہ چاہتا کہ منظوری نہ ملے تو یوں لکھتا۔ اگرچہ یہ کیس قانون کے عین مطابق ہے لیکن اس میں فلاں خرابی ہے۔ اور ہم یہ خرابیاں نظرانداز نہیں کر سکتے۔

ٹیڑھی بات کو یوں پیش کرتا کہ وہ سیدھی اور معصوم نظر آئے اور سیدھی بات کو یوں الجھا دیتا کہ پڑھنے والے میں گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ پیدا ہو جائے۔ زبیر کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

لیکن وہ خصوصی نوٹ جس کی وجہ سے زبیر کی بڑی مانگ تھی ایک تیسری قسم کا نوٹ تھا۔

ان کے دفتر کا سربراہ جسے سب بڑا صاحب کہتے تھے ایک سینئر سی ایس پی افسر تھا۔ جس کی ذہانت کی کسی زمانے میں بڑی دھوم تھی لیکن جسے دیر سے روپیہ، اقتدار اور اسٹیٹس

نے چاٹ لیا تھا۔ شہد ٹپک گیا تھا، خالی کھگارہ گیا تھا۔

اب وہ صرف مطلب کی بات سمجھتا تھا۔ باقی امور میں ہائلی کنفیوزڈ تھا۔ طبیعت میں چڑچڑاپن بہت بڑھ گیا تھا۔ غیر تعمیری نکتہ چینی کی عادت پڑ گئی تھی۔

تجربے کی بنا پر دفتر کے افسروں کو علم تھا کہ بڑے صاحب سے منظوری لینے کے لئے ضروری ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، کے اصول پر عمل کیا جائے یعنی بڑے صاحب کو مزید کنفیوز کیا جائے۔ اتنا کنفیوز کیا جائے۔ اتنا کنفیوز کیا جائے کہ ان کی طبعی کنفیوژن خود ششدر رہ جائے۔

ایسی کیفیت طاری ہونے پر وہ گھبرا کر بلا چون و چرا دستخط کر دیا کرتے تھے۔

بڑے صاحب کو کنفیوز کرنے والا نوٹ لکھنے میں زبیر کو ملکہ حاصل تھا۔

رفعت کو اکاؤنٹس کی پیچیدگیوں پر عبور حاصل تھا۔ زیادہ تنخواہ کلیم کرنے کے لئے، الاؤنسز میں اضافہ کرانے کے لئے اور ناجائز مراعات پر حق جتانے کے لئے صاحب لوگ رفعت کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔ دفتر میں رفعت تنخواہ تو سرکار سے لیتا تھا لیکن کام سرکاری مفاد کے خلاف کرتا تھا کیونکہ افسران اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لئے اسے استعمال کیا کرتے تھے۔

قائم کو جدید طرز کی انگریزی لکھنے میں بڑی مہارت تھی۔ اس نے کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کو شروع سے آخر تک متعدد بار پڑھا تھا اور غیر مروجہ ایڈیمز کے استعمال میں دسترس حاصل کر رکھی تھی۔ اسنیک کارنر میں بیٹھ کر وہ اپنے دوستوں کو بتایا کرتا تھا کہ فلاں افسر کس قدر غلط انگریزی لکھتا ہے۔ فلاں صاحب کی انگریزی بالکل دفتری رنگ کی ہے۔ فلاں صاحب پریپوزیشن کا غلط استعمال کرتے ہیں اور فلاں صاحب کے ہجے غلط ہیں۔

اسنیک کارنر میں بیٹھ کر قیصر، زبیر، رفعت اور قائم باری باری افسروں کی نالائقی کے قصے سنایا کرتے تھے جنہیں ان کے ٹولے کے لوگ بڑی دلچسپی سے سنتے۔ ان کی قابلیت پر واہ واہ کرتے اور اسی ضمن میں مزید چٹکلے سنا کر ان کی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے۔

ہاں تو اس واقعہ پر قائم کے اسنیک کارنر کے ساتھیوں نے بڑی خوشی منائی تھی اور اسے پیٹیز اور پیسٹری والی چائے کی شاندار پارٹی دی تھی اور قائم نے اپنے ساتھیوں کے

خلوص بھرے جذبے سے متاثر ہو کر مہمان خصوصی کی حیثیت سے دھواں دھار تقریر کی تھی۔ اور میز پر مکے مار مار کر اعلان کیا تھا۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اسنیک کارنر کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ تم سے اپنا رابطہ کبھی نہیں توڑ سکتا۔ میں کبھی جھوٹے اسٹیٹس کا شکار نہیں ہوں گا۔ کیونکہ جھوٹے اسٹیٹس کا شکار ہونا چھوٹے ذہن کے لوگوں کا کام ہے۔ ایسے لوگوں کا، جو خالی ہوتے ہیں، کھوکھلے ہوتے ہیں اور ان کی اہمیت کا تمام تر دارومدار اسٹیٹس کی بیساکھیاں ہوتی ہیں۔ میں، میں عوامی افسر بنوں گا۔

اس روز جب قائم اسنیک کارنر سے باہر نکلا تو اس کی گردن پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ اور دل احسان مندی کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔

ہاں تو قائم دین سمجھتا تھا کہ یہ واقعہ اس کی زندگی کا عظیم ترین واقعہ ہے۔

اس واقعہ کے کوائف سیدھے سادے تھے۔ یہ ایک عام سا واقعہ تھا جو کبھی کبھی کلرکوں کی زندگی میں رونما ہو جایا کرتا ہے۔

ہوا یوں کہ محکمے کے وزیر نے بڑے صاحب کو فون کیا کہ انہیں پنجاب کے کلچر پر ایک تقریر کرنا ہے لہٰذا دفتر کے کسی افسر کو بھیج دیں تاکہ وہ اسے تقریر کے متعلق بریف کر دیں۔

بڑے صاحب نے ایک ان فارمل میٹنگ منعقد کی جس میں سارے افسروں کو بلایا اور انہیں دعوت دی کہ تقریر لکھنے کے لئے والنٹیر کریں۔

دفتر کے افسر بہت پڑھے لکھے تھے۔ حالات حاضرہ اور ملکی سیاست سے ضرورت سے زیادہ واقف تھے۔ پنجابی کلچر کے بارے میں بھی ان کی معلومات خاصی وسیع تھیں چونکہ انہوں نے پنجابی کلچر پر مغربی مصنفوں کی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں۔ جی ٹی روڈ پر گاڑی چلاتے ہوئے بیسوں پنجابی گاؤں دیکھے ہوئے تھے۔ دیہاتی رہن سہن کے متعلق پنجابی فلموں سے بڑی معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔

اس کے باوجود پتہ نہیں کیوں، بڑے صاحب کے سامنے سارے افسر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ کسی نے تقریر لکھنے کی ہامی نہ بھری۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کر دل ہی دل میں لاشعوری طور پر وہ سمجھتے تھے کہ پنجاب اور کلچر دو متضاد چیزیں ہیں اور کلچر وہ ہوتا ہے جو دساور سے درآمد کیا جائے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جو مغربی کلچر کو نہیں اپناتے تھے۔ لیکن پنجابی کلچر کے

متعلق وہ بھی مجبور تھے۔ چونکہ ان کا ایمان تھا کہ کلچر زبان کی پیداوار ہے اور زبان اسے نہیں کہتے جو DIALECT کی حیثیت سے بولی جاتی ہو بلکہ اسے کہتے ہیں جو کتابی دنیا میں رائج ہو اور جہاں یہ کتابی زبان رائج نہ ہو وہاں کلچر کیسا. وہاں تو تمدنی خلا ہوتا ہے۔

بہر حال بڑے صاحب کے سامنے افسر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ کسی نے تقریر لکھنے کے لئے اپنے آپ کو پیش نہ کیا۔ لہٰذا بڑے صاحب نے قائم دین کو بلا کر تقریر لکھنے کی ذمہ داری اسے سونپ دی۔

قائم نے بڑی محنت سے تقریر لکھی جسے پبلک اور پریس نے بے حد پسند کیا۔ وزیر صاحب اس واہ واہ پر پھولے نہ سمائے۔

اسے حسن اتفاق کہہ لیجئے کہ ابھی واہ واہ کی کیفیت طاری تھی کہ وزیر صاحب کے پاس ایک فائل پہنچی جس میں ایک افسر کی تعیناتی کے متعلق منظوری طلب کی گئی تھی۔ چونکہ وہ ایک سلیکشن پوسٹ تھی لہٰذا وزیر صاحب نے تعیناتی کے لئے قائم دین کا نام لکھ دیا۔

یوں قائم دین ایک دم بیٹھے بٹھائے افسر بن گیا۔

اپنے نئے عہدے کا چارج لینے کے بعد چار ایک دن تو قائم دین بڑی بے نیازی سے سے جوں کا توں دفتر جاتا رہا اور اپنے آپ کو یقین دلاتا رہا کہ وہ اسٹیٹس کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ تو اپنی قابلیت کے زور پر افسر بنا ہے اور اسٹیٹس کیا ہے۔ بیساکھیاں اور کیا۔

پھر چند ایک روز کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ افسروں میں اس قدر نمایاں نظر آتا ہے جیسے راج ہنسوں میں کوا بیٹھا ہو۔ لہٰذا اس نے سوچا کیوں نہ میں اپنا پہناوا افسروں جیسا کر لوں۔ اس سے کیا فرق پڑے گا۔ ظاہر کو بدلنے سے باطن تو نہیں بدل جاتا نا۔ اصل اہمیت تو باطن کی ہے۔

اسی شام اس نے ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکان سے مکسڈ پولی ایسٹر اور ایجنسن کاٹن کی دو قمیصیں خرید لیں۔ اور دو جدید قسم کی نائیاں بھی۔ پھر سوانا خرید کر اس نے دو پتلونیں سینے کیلئے دے دیں۔

اسے علم نہ تھا کہ سفید قمیص اور سٹف کالر سے بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ بس اتنی سی بات تھی۔ سفید قمیص. سٹف کالر۔ کالی پتلون اور امپورٹڈ ٹائی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے سوچا۔

پھر ایک روز اس کی توجہ اپنے نام کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس نے نوٹ کیا کہ ساتھی افسر جب بھی اس سے بات کرتے تو مسٹر قائم کہہ کہ دمت رک جاتے ہیں جیسے دین کہنے سے ہچکچا رہے ہوں۔ پہلے تو وہ اسے بلا جھجک قائم دین کہہ کر بلایا کرتے ۔۔ قائم دین یہ رپورٹ اسٹڈی کر لو۔ کیا وہ آرٹیکل مکمل ہو گیا۔ قائم دین۔

آخر کیا بات تھی۔ اس لئے تو نہیں کہ اب وہ افسر بن چکا تھا۔ شاید دین کا لفظ آفیسر لائیک نہ ہو۔

بات تو ٹھیک تھی۔ تہذیب و تمدن تو سیکولر قسم کی چیز ہوتی ہے۔ جس میں دین کو شامل کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اگرچہ پاکستان اسلامی جمہوریہ بن چکا تھا اور جب نیشنل اسمبلی میں وزراء نے حلف اٹھایا تھا تو پہلی مرتبہ حلف کے متن میں اللہ اور محمد صلعم کے نام شامل کیے گئے تھے۔ لیکن وہ تو ایک سیاسی اسٹنٹ تھا۔ اور پھر وزراء تو عوام کے نمائندے ہوتے ہیں افسر تو نہیں ہوتے۔ افسروں کا دستور تو نہیں بدلا تھا۔ ان کا برتاؤ اور زاویہ نظر تو جوں کا توں اسی رنگ پر قائم تھا۔

بہر طور قائم نے شدت سے محسوس کیا کہ اسے اپنے نام کے متعلق کچھ کرنا چاہئے۔ کوئی ایسی تبدیلی عمل میں لانی چاہئے جس سے دوسرے افسروں کو اسے بلانے میں تکلیف نہ ہو۔ یہ تو محض کرنسی کی بات ہے کوئی بنیادی تبدیلی تو نہیں نا۔ اس مسئلے پر وہ دو دن سوچتا رہا۔

دین تو ایک ایسی چیز ہے جو دل سے تعلق رکھتی ہے۔ نمائش کی چیز نہیں۔ پھر کیوں نہ میں دستور کے مطابق دین کو کیمیا فلاج کر لوں۔ اکثر آفیسر دین قسم کے نام مثلاً اسلام. محمد. نبی. اللہ کیمیا فلاج کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایم ایم احمد میں. این این قریشی میں. این ایم خان میں۔

اس حساب سے میں ڈی قائم بن سکتا ہوں لیکن ڈی قائم کچھ جچتا نہیں۔ اگر نام میں کوئی ایسا لفظ بڑھا دیا جائے۔ جو چھوٹی ی پر ختم ہو تو بات بن جائے۔ سارے افسروں کے ناموں کے آخر میں ایسے لفظ ہوتے ہیں مثلاً شمسی، زبیری، حسنی، جعفری۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس کے دادا کئی ایک سال مصر میں مقیم رہے تھے۔ کیوں نہ میں اپنے نام کے پیچھے مصری لگا لوں۔

قائم نے اسی وقت ایک فارم منگوایا اور اس پر نام کے سامنے ڈی مصری لکھ دیا پھر اس نے تین سبوں پر اپنے دستخط کر کے ان سبوں کو فرم کے ساتھ کوپن کیا اور وہ فارم اسے جی پی آر کو بھیج دیا۔ اس کے بعد اسی نام سے اس نے بینک میں اکاؤنٹ کھول لیا۔

یوں قائم دین مسٹر کے ڈی مصری بن گیا۔

اس تبدیلی کے بعد دو ایک دن وہ بہت مطمئن رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے نئے حالات اور پوزیشن سے ظاہری ایڈجسٹ منٹ کر لی ہے۔

اگلے روز تمام آفیسر مل بیٹھے تاکہ پک نک کا پروگرام طے کریں۔ وہاں برسبیل تذکرہ کسی افسر نے ایک جوک سنایا۔ جسے سن کر قائم یوں قہقہہ مار کہ ہنسنے لگا جیسے وہ اسنیک کارنر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنسا کرتا تھا۔

اسنیک کارنر میں قائم اپنے قہقہے کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایک بار تو وہ میز پر دونوں ہاتھ مار مار کر یوں ہنسا تھا کہ میز پر رکھی پیالیاں گر کر چور چور ہو گئی تھیں۔

قائم دین کا قہقہہ بہت ہی منفرد تھا۔ قہقہہ مارتے ہوئے اس کے جسم کا اوپر کا حصہ یوں اچھلتا تھا جیسے ربڑ کا گیند اچھلتا ہے اور یہ عمل دیر تک جاری رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہنستے ہوئے اسے میز پر بار بار ہاتھ مارنے اور میز کے نیچے ٹانگیں چلانے کی عادت تھی۔ اسے ہنستے دیکھ کر احساس ہوتا جیسے بھونچال آگیا ہو۔ اسنیک کارنر میں قائم کا یوں ہنسنا ایک خوبی سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ سب کا خیال تھا کہ پورے وجود سے ہنسنا بھرپور خلوص کی نشانی ہے۔

لیکن اس روز افسروں کی موجودگی میں قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے دفعتاً وہ سلف کانشس ہو گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ دفعتاً سارے افسر خاموش ہو گئے ہیں اور اس کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس پر قائم بہت آکورڈ محسوس کرنے لگا تھا۔

افسروں کے چلے جانے کے بعد وہ بے نام احساس ندامت سے بھیگ گیا۔ اور اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ یوں بچوں کی طرح منہ پھاڑ کر بے تحاشا ہنسنا۔ پروپرایٹی کیٹ کے منافی ہے۔

بات بھی درست تھی افسر کا کام قہقہہ لگانا نہیں ہوتا اسے تو تبسم پر اکتفا کرنا چاہیے اور تبسم بھی ایسا جس پر اپری سی ایشن ہو، پارٹی سی پیشن نہ ہو۔ بلکہ پیٹرنائی زیشن کی جھلک ہو۔

اس روز قائم نے شدت سے محسوس کیا کہ اسے اپنے برتاؤ اور بیرنگ کی تمام تفصیلات کا جائزہ لینا چاہیے۔

اسی روز دفتر بریک ہونے کے بعد کاریڈور میں چلتے ہوئے اس نے اپنی چال کا جائزہ لیا۔

اونہوں۔ بالکل غیر موزوں، میں تو یوں چل رہا ہوں جیسے سر کے بلانے پر پی اے بھاگا بھاگا آتا ہے، بے شک چال میں اسمارٹنس تو ہے۔ لیکن ایسی اسمارٹنس تو کارکنوں کو زیب دیتی ہے۔ افسروں کی چال میں تو ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ گریس فلم ردھم ہوتا ہے، وقار ہوتا ہے، خود آگاہی ہوتی ہے۔

قائم نے کاریڈور میں افسرانہ چال چلنے کی کوشش کی پھر اسے خیال آیا کہ کاریڈور میں اور لوگ بھی تھے، اس پر اس کے پاؤں رک گئے۔

شام کو ٹہلنے کے بہانے وہ باہر نکل گیا اور ویران سڑک پر افسرانہ چال چلنے کی مشق کرتا رہا۔ واپس گھر پہنچا تو کرسی پر بیٹھتے ہی اس کو خیال آیا کہ بیٹھنے کے انداز کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ افسر لوگ کس انداز میں بیٹھتے ہیں۔

سب سے پہلے اس کی توجہ بڑے صاحب کی طرف منعطف ہوئی۔ کئی ایک بار بلائے جانے پر وہ اس کے کمرے میں گیا تھا اور اس نے غور سے اس کے بیٹھنے کا انداز دیکھا تھا۔ اسکے بیٹھنے میں مصروفیت کی جھلک نہ تھی جیسے کہ دوسرے افسر بڑی محنت سے پیدا کرتے ہیں۔ مصروفیت کی جگہ اس کے انداز میں فارغ البالی کی جھلک تھی۔

بڑے صاحب کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے سارا سیکرٹریٹ اور ملحقہ باغات اور فوارے اس کی ذاتی ملکیت ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے انداز میں رعونت تھی بے نیازی تھی، گرد و پیش کے لئے مبہم سی حقارت تھی۔

چھوٹے افسر جب بڑے صاحب کے کمرے میں جاکر سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھتے تو ان کا انداز لجاجت سے بھر جاتا۔ گردن ڈھلک جاتی۔ اپنے کمرے میں بیٹھتے تو

گردن اکڑ جاتی۔ ماتحت سے بات کرتے تو تیوری چڑھ جاتی۔ پبلک کے کسی سرکردہ شخص سے بات کرتے تو مجسم اخلاق بن جاتے۔ ساتھ افسروں سے خوش مزاجی اور قابلیت کا روپ دھار لیتے۔ سائل کے سامنے عدیم الفرصتی اور اصولوں کی وجہ سے مجبور نظر آتے۔

قائم کے لئے آفیسر لائیک انداز کی ساری تفصیلات اپنانا خاصہ مشکل کام نظر آنے لگا۔ اسے احساس ہونے لگا جیسے افسری اس کی زندگی میں سیلاب بن کر آئی ہو۔ اس سیلاب میں پرانی ایڈجسٹ منٹس سب بہہ گئی ہوں۔ اور قدم قدم پر نئی ایڈجسٹ منٹس پیدا کرنے کی فوری ضرورت پیدا ہو گئی ہو۔

پرانے تعلقات، رشتے، برتاؤ، خزاں زدہ پتوں کی طرح، جھڑ رہے تھے اور اس ٹنڈ منڈ تنے پر نئی پتیاں ٹانکنے کی مشکل پیش پیش تھی۔

برتاؤ کی نئی تفصیلات کو عمل میں لانا اس قدر مشکل نہ تھا۔ دقت یہ تھی کہ برتاؤ کی وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات جو سالہا سال سے اس کی نس نس میں رچی ہوئی تھیں اور جو ہر وقت ان جانے میں آپ سرزد ہو جاتی تھیں، ان سے پہلو بچانا بے حد مشکل تھا۔

کئی دن تک وہ چلنے، بیٹھنے، کھڑے ہونے اور مسکرانے کی مشق کرتا رہا۔ باتھ روم کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر وہ مختلف انداز کی مسکراہٹیں آزماتا اور پھر دوسرے افسروں کی مسکراہٹوں سے ان کا موازنہ کرتا۔

دفتر میں اس کا آئیڈیل ایم پی ریسانی تھا۔ اس کا طور طریقہ اور بیرنگ قائم کو بہت پسند تھے۔

ریسانی ایک جونیئر سی ایس پی افسر تھا۔

جونیئر سی ایس پی افسر عام طور سے بڑی خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ان میں ذہانت ہوتی ہے، لیڈر شپ ہوتی ہے، چمک ہوتی ہے، جذبہ، خلوص اور کام کرنے کا شوق ہوتا ہے۔

سروس کے ابتدائی دور میں بڑے جوش اور انہماک سے کام کرتے ہیں پھر آہستہ آہستہ اقتدار کا نشہ ان کے خون میں سرایت کر جاتا ہے۔ آرام و آسائش کی دیمک لگ جاتی ہے سیاست کی لت پڑ جاتی ہے۔ آرام، روپیہ، اقتدار اور خود پسندی انسانیت کو چاٹ جاتے ہیں اور پیچھے عفریت رہ جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے آخری

دور میں سی ایس پی ڈھانچہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

اسنیک کارنر میں اکثر سی ایس پی افسر زیر بحث آیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق وہاں کئی ایک قصے چلتے تھے۔ سب سے زیادہ مقبول قصہ یہ تھا کہ جب سی ایس پی افسر کا تبادلہ کسی نئے محکمے میں ہو جاتا ہے جس کے طریق کار سے اسے واقفیت نہیں ہوتی تو پہلے سال وہ اسٹینو، سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ اور سیکشن افسروں سے کام کے کوائف کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے اور ماتحت بتاتے ہیں۔ اور وہ "آئی سی، آئی سی" کہہ کہہ کر وقت گزارتا ہے۔ دوسرے سال میں وہ انہی ماتحتوں کو "یو سی، یو سی" کہہ کہ باتیں سمجھاتا ہے۔ اور پھر تیسرے سال "وہائی کانٹ یو سی" کہہ کر انہیں ڈانٹتا ہے۔

سی ایس پی افسروں کی ذہانت اور محنت بے شک قابل داد ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس لئے محنت کرتے ہیں کہ ان کی برتری قائم رہے۔ ان کی پوزیشن اور پرسٹیج میں فرق نہ آئے۔ ان کی قابلیت کی دھاک بیٹھی رہے۔

بہر حال رئیسانی جو جونیئر سی ایس پی افسر تھا، یقیناً مثالی افسر تھا۔ ابھی افسری اس کی ہڈی تک نہ پہنچی تھی۔ ابھی اس میں ولولہ تھا، خدمت کا جذبہ تھا۔

ہاں تو قائم بہانے بہانے رئیسانی کے کمرے میں جاتا تاکہ اس کے برتاؤ کی تفصیلات کا مطالعہ کرے اور انہیں اپنائے۔

انہی دنوں میں قائم پر انکشاف ہوا کہ اس کی بات کرنے کا انداز آفیسر لایک نہیں۔ یہ بڑا تلخ احساس تھا۔

دفتر میں افسروں اور ماتحتوں کے بات کرنے کا انداز بالکل جدا جدا ہوتا ہے۔ اس حد تک جدا کہ اگر کوئی آپ سے بات کرے تو آپ کو فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ وہ افسر ہے یا ماتحت۔

بنیادی فرق یہ ہے کہ افسر اردو انگریزی میں بولتے ہیں اور ماتحت انگریزی اردو میں بولتے ہیں۔

حالانکہ قائم انگریزی لکھنے میں بڑا ماہر تھا۔ اسے آکسفورڈ یو سیج پر ملکہ حاصل تھا۔ لیکن اسے انگریزی بولنے کی مشق نہ تھی۔ چونکہ فونٹکس پر حاوی نہ تھا۔ الٹا وہ تو انگریزی اردو میں بولا کرتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ منہ بگاڑنے کے حق میں نہ تھا۔ وہ اس فیشن کو

بناوٹ سمجھتا تھا۔

اسٹیک کارتر کے دور میں وہ انگریزی میں اردو بولنے کے مروجہ فیشن پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ اس نے بارہا اس بدعت کو دور کرنے کی اسکیمیں بنائی تھیں۔ اس نے کئی بار سوچا تھا کہ وزیر تعلیم کو ایک طویل مراسلہ لکھے جس میں یہ اپیل کی جائے کہ پاکستانی کلچر کو مغربیت کی وباء سے بچانے کا ایک موثر طریقہ یہ بھی ہے کہ انگریزی زبان کو فارن لنگویج سمجھ کر برتا جائے۔ یعنی انگریزی کو اردو میں بولنے کی رسم ڈالی جائے۔

ان دنوں اس کا ایمان تھا کہ ہمارے کلچر کو سب سے زیادہ نقصان وہ ادارے پہنچا رہے ہیں جو اردو کو انگریزی میں بولنے کے فیشن کو اچھال رہے ہیں اور انگریزی کو اس انداز سے بولنے کی رسم ڈال رہے ہیں جیسے وہ ہماری مادری زبان ہو۔ مثلاً ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن انگریزی خبریں یوں پڑھتے ہیں جیسے ابھی ابھی آکسفورڈ سے آئے ہوں۔ ٹیلی ویژن کے اکثر کمپیئر اردو کو یوں انگریزی میں بولتے ہیں جیسے اسلام آباد میں ایف۔ سکس تھری یا ڈپلومیٹک ایونیو مخاطب ہوں۔ صرف یہی نہیں ٹیلی ویژن میں تو مغنیہ بھی اردو گانے انگریزی اکسنٹ میں کرتی ہیں۔

"آ آگر۔ ہائے۔ جا آذبہ اے۔ تامیر زند آ"

پھر انگریزی میڈیم اسکول میں جہاں ابتدا ہی سے بچوں کو اردو انگریزی میں بولنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

اس بیماری کے جراثیم کالجوں کے راستے سیکرٹریٹ میں پہنچتے ہیں اور افسران کی گفتگو کو رنگ دیتے ہیں۔ ان دنوں قائم کا خیال تھا کہ اردو کو انگریزی میں بولنے کے تباہ کن فیشن کی کاٹ کرنے کا موثر ترین طریقہ یہ ہے کہ انگریزی کو اردو میں بولنے کی رسم ڈالی جائے۔

لیکن یہ تو جب کی باتیں تھیں۔ اب تو وہ خود بولتے ہوئے اردو الفاظ کو گولائیاں بخشنے کی مشق کر رہا تھا۔ اسی رجحان کے تحت اس نے اپنے نام کے ہجے بدل کر اسے اسپے سائز کر دیا تھا۔ پہلے وہ قائم کو فلیٹ لکھتا تھا۔ کیو اے آئی ایم۔ اب اس نے ہجوں کے ذریعے اس میں موزوں گولائی پیدا کر لی تھی۔

کیو یو اے آئی ام

مہذب و متمدن انداز میں بولنے کا تمام تر انحصار ہونٹوں پر ہوتا ہے۔ ہونٹوں کو گول کرنا، آواز کو گھمانا، رولنا، طے کرنا، زبان کی نوک کو دانتوں سے چھونا۔

ان چھوٹی چھوٹی ایڈجسٹ منٹس میں اسے کئی مہینے لگ گئے۔

اس دوران میں اسے مکان مل گیا تھا اور وہ ڈائننگ اور ڈرائنگ روم کو سیٹ کرنے میں مصروف تھا۔

اس نے کئی بار سوچا کہ جب وہ نئے گھر میں منتقل ہو جائے گا اور گھر کو فرنش کرے گا تو پھر اپنے پرانے اسنیک کارنر کے ساتھیوں کو ٹھاٹھ دار دعوت دے گا۔ اب جبکہ کمرے سیٹ ہو گئے تھے تو وہ انہیں بلانے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

ابتدائی دور میں اس نے کئی مرتبہ کوشش کی تھی کہ وقت نکال کر اسنیک کارنر میں جائے اور اپنے پرانے ساتھیوں سے ملے۔ لیکن جب بھی وہ جانے کا پروگرام بناتا تو عین موقع پر اسے کوئی ضروری کام پڑ جاتا۔

ایک مرتبہ تو وہ اسنیک کارنر کی طرف چل بھی پڑا تھا۔ لیکن راستے میں اسے خیال آیا کہ اس وقت اس کے ساتھیوں کا اسنیک کارنر میں موجود ہونا ممکن نہیں۔ اس خیال پر وہ لوٹ آیا تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ کسی ایسے وقت اسنیک کارنر میں جانا چاہئے جب وہاں زیادہ لوگ نہ ہوں۔ صرف ان کے ساتھی ہوں۔ اگر اسٹاف نے اسے وہاں دیکھ لیا تو وہ باتیں بنائیں گے اور چلتے چلتے بات افسران تک پہنچے گی۔ اگرچہ اسے ایسی باتوں کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی پھر بھی کوئی ایسا قدم اٹھانا جس پر انگلیاں اٹھیں مناسب بات نہیں تھی۔ دوستی بے شک ایک اعلیٰ جذبہ ہے لیکن رکھ رکھاؤ بھی تو کوئی چیز ہے۔

انہی دنوں اس کا دوست رئیسانی سیکورٹی ڈائریکٹوریٹ کا ڈائریکٹر بن گیا۔ حکومت نے اس ڈائریکٹوریٹ کی بلڈنگ سیکرٹریٹ کے باہر تعمیر کی تھی۔

پہلی مرتبہ سیکورٹی ڈائریکٹوریٹ کی طرف جاتے ہوئے دفعتاً قائم چونک پڑا۔ اس کے سامنے ایک سرخ عمارت تھی جو خاصی مانوس نظر آتی تھی۔ پتہ نہیں کونسی عمارت تھی وہ۔ دروازے کے پاس لوئر اسٹاف کا جم گھٹا لگا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں رک گئے۔ گھبرا کر اس نے اپنا رخ بدل لیا۔

اس کے بعد قائم کو اکثر رئیسانی کے پاس جانا پڑتا تھا۔ رئیسانی قائم کی ڈرائنگ کا

مداح تھا۔ جب بھی اسے کوئی طویل رپورٹ لکھنی ہوتی تو وہ قائم کو بلا بھیجتا۔

رئیسانی کے پاس جانے کے لئے قائم نے ایک نیا راستہ دریافت کر لیا تھا جو اج کے پچھواڑے سے ہو کر پارک سے ہوتا ہوا گھوم پھر کر ڈائریکٹوریٹ پہنچتا تھا۔

سال بھر اس راستے سے آنے جانے کے بعد وہ اس امر کو قطعی بھول چکا تھا کہ اس نے وہاں جانے کے لئے اتنا طویل راستہ کیوں اختیار کر رکھا ہے کہ وہ سیدھے راستے سے وہاں جانا کیوں پسند نہیں کرتا کہ سیدھے راستے سے جانے میں کونسی مشکل حائل تھی۔ وہ یہ سب تفصیلات فراموش کر چکا تھا۔

وہ سرخ عمارت تو اس کے ذہن سے بالکل ہی اتر گئی تھی۔ قائم سچے دل سے یہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ طویل راستہ اس نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ راستہ خوبصورت ہے۔ جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں۔ سرخ بجری کی روشیں دو رویہ بڑے بڑے پام۔

ایک روز رئیسائی نے قائم سے فون پر کہا۔ "بھئی ابھی چلے آؤ ضروری کام ہے۔"

جب قائم رئیسانی کے دفتر پہنچا تو وہ غیر از معمول ٹیرس پر بیٹھا تھا۔

"ہیلو مصری" وہ چلایا "دس وے"۔

"یہ کیا بیٹھنے کی جگہ ہے۔" قائم نے پوچھا۔

"کم آئی وانٹ ٹو شو یو سم تھنگ لک" اس نے ملحقہ سرخ عمارت کی طرف اشارہ کیا "ڈو یو نو دس بلڈنگ"۔

قائم نے بڑے غور سے ملحقہ سرخ بلڈنگ کا جائزہ لیا۔ اور پھر سر نفی میں ہلا دیا۔

"بھئی یہ اسٹاف کا ریستوران ہے اسنیک کارنر"۔

"اوہ ...... آئی سی۔" قائم چونک سا گیا۔

"لیکن اس کا نام اسنیک کارنر نہیں۔ بلکہ نوائے ـــــ کارنر ہونا چاہئے۔ یہ شور سن رہے ہو۔"

"میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔" اسنیک کارنر میں کوئی شخص میز پر مکے مار مار کر چلا رہا تھا۔ میں اسنیک کارنر کو کبھی نہیں بھول سکتا۔"

"یہاں ہر وقت کلرک لوگ غل غپاڑہ مچائے رکھتے ہیں۔" رئیسانی بولا۔ "اٹ ازاے پرپیچول سورس آف ڈسٹربنس۔"

"وہائی بادر" قائم نے کندھے جھٹکے۔

"اسی لئے تو میں نے آج تمہیں بلایا تھا۔" رئیسانی نے کہا۔ "آئی وانٹ ٹونیک اوور دس اسنیک کارنر۔"

"کیا مطلب؟" قائم نے پوچھا۔

"فیکٹس یہ ہیں کہ یہ بلڈنگ گورنمنٹ کی ہے۔ خیال تھا کہ اسے ایک جنرل ریسپشن بنایا جائے۔ لیکن بعد میں یہ پرپوزل کینسل ہو گیا۔ پھر اسے اسٹاف کے لئے ریستوران بنا کر ٹھیکے پر دے دیا گیا۔ گٹ می۔"

"یس" قائم نے کہا۔

"اب ہم چاہتے ہیں کہ یہ بلڈنگ سیکورٹی گارڈز کو ہاؤس کرنے کے لئے ٹیک اوور کر لیں۔ ایسا کوئی ڈرافٹ بنا دو کہ" . . . رئیسانی رک گیا۔

اسنیک بار سے شور کا ایک ریلا آیا۔

"میں تم سے ہمیشہ رابطہ قائم رکھوں گا۔" اسنیک بار میں کوئی چیخ رہا تھا۔ "میں جھوٹے اسٹیٹس کا دیوانہ نہیں ہوں۔ میں عوامی افسر بنوں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے کوئی فنکشن ہو رہا ہے۔" قائم نے کہا۔ "کسی کو پروموشن ملی ہے۔"

"یہاں روز یہ فنکشن ہوتا ہے۔ یہ ٹی ہاؤس نہیں۔ چیپ اسکینڈل کا اڈا ہے۔"

"یہاں افواہیں مینو فیکچر ہوتی ہیں۔ بغاوت پلتی ہے اٹ مسٹ بی ٹیکن اوور۔"

"اونو" . قائم نے پہلی مرتبہ رئیسانی کے خیال کو شدت سے رد کر دیا۔ شاید پرانی یادوں نے اس کے دل میں چٹکی بھری ہو۔ دے آر جسٹ پورسے۔ جن کے پاس ذہانت نہیں۔ علم نہیں پوزیشن نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ دے آر اگنورینٹ نن کم پوپس۔ دے جسٹ سٹ اینڈ ناٹ آل سارٹس آف بالڈر ڈیش۔"

"جھوٹے اسٹیٹس کا دیوانہ وہ ہوتا ہے۔" کوئی اسنیک کارنر میں چلا رہا تھا۔
"جس میں قابلیت نہ ہو، ذہانت نہ ہو۔ محنت کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ میں کبھی اسٹیٹس کی بیساکھی کا سہارا نہیں لوں گا۔"

"سی" قائم نے رئیسانی سے کہا۔ "اونو . . آئی ڈو ناٹ اگری ودیو۔ سیکرٹریٹ کے اس سیفٹی والو کو بند نہ کرو۔

اسنیک کارنر میں وہ سب قہقہے مار رہے تھے نعرے لگا رہے تھے۔ "کتنی خوشی کی بات ہے واٹ گڈلک۔"

شاید وہ گڈلک ہی ہو۔ کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔

شام نواس

اب مجھے بات سمجھ میں آئی ہے۔ سارا فساد شام نواس کا تھا۔ شام نواس محلّہ آڑھتیاں میں ایک مکان تھا۔ دیکھنے میں اچھا خاصہ تھا۔ دو منزلہ۔ تین بیڈ، ایک بیٹھک، فراخ باورچی خانہ اور نشست گاہ۔ دو باتھ۔ بس ایک ہی کمی تھی۔ صحن نہیں تھا اس لئے روشن نہ تھا۔ میں نے اس بات کو مانئنڈ نہ کیا۔ پرانی طرز کے مکان روشن نہیں ہوتے۔

اس لئے میں نے گذشتہ چند سال میں بڑے مکان بدلے ہیں۔ بظاہر حالات کی وجہ سے۔ شاید یہ بھی ہو کہ میں ایک مکان میں رہتے رہتے اکتا جاتا ہوں اور ان جانے میں ایسے حالات پیدا کر لیتا ہوں کہ مکان بدلنا لازم ہو جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ آج تک میں نے اپنی طبیعت کا بھید نہیں پایا۔

مثلاً آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جنہیں میں جانتا نہیں مگر مانتا ہوں۔ کچھ ایسی ہیں جنہیں جانتا ہوں مگر مانتا نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے ذہن میں جاننے کا خانہ اور ہے ماننے کا اور۔ دونوں میں کوئی میل نہیں۔ یہ بات میں اپنے پڑھے لکھے دوستوں کو نہیں بتاتا۔ بتا دوں تو وہ میرا مذاق اڑائیں گے۔ کہیں گے مجھ میں ربط نہیں۔ جاننے کے بغیر ماننا بے عقلی کی دلیل ہے۔

میں پوچھتا ہوں۔ کون ہے جس میں ربط ہے۔ کس میں بے عقلی کے داغ دھبے نہیں ہیں۔

مکانوں کے متعلق میرے مشاہدے عجیب سے ہیں۔ وہ عقل پر نہیں بلکہ حسیات پر مبنی ہیں۔

کوئی مکان ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی آگے بڑھتا ہے۔ باہیں پھیلا دیتا ہے۔ آیئے، آیئے بسم اللہ جی آیاں نوں۔ آپ اس مکان میں یوں سیٹ ہو جاتے ہیں جیسے پرانے جوتے میں پاؤں۔ مکان کے کمرے ایک بے نام سے "رنگ" سے بھرے محسوس ہوتے

ہیں۔
پہلے دن ہی آپ محسوس کرتے ہیں جیسے عرصہ دراز سے وہیں رہتے آئے ہوں۔

کوئی مکان ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ ماتھے پر تیوری پڑ جاتی ہے۔ کون ہیں آپ۔ خواہ مخواہ اندر گھسے آرہے ہیں۔

کچھ مکان اداس ہوتے ہیں۔ آہیں بھرتے ہیں۔ کراہتے ہیں۔ کچھ ہنسنے کھیلنے پر مائل کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ کچھ کریں اور کچھ نہیں تو مل بیٹھیں۔

ان دنوں میں مکان بدلنے پر مجبور تھا۔ مالک مکان نے نوٹس دے رکھا تھا۔ مالک مکان سے لڑنے جھگڑنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ کون مصیبت میں پڑے۔

میں نے چار ایک مکان دیکھے تھے۔ شام نواس پسند آیا تھا۔ کرایہ بھی کم تھا۔ جگہ بھی اچھی تھی۔ کمرے بھی کھلے تھے۔

جب میں مکان دیکھ کر باہر نکلا تو ایک بوڑھے نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولا۔ بابو جی، یہ مکان نہ لینا۔ سخت ہے۔ پچھلے کرایہ دار کی بیوی نے یہاں خودکشی کر لی تھی۔ جب سے خالی پڑا ہے۔ کوئی کرائے پر نہیں لیتا۔

تین چار دن میں سوچتا رہا۔ لوں یا نہ لوں۔

ان دنوں میرے حالات اچھے نہ تھے۔ میں نے خود بگاڑے تھے اور سنوارنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا۔

میری ملازمت اچھی خاصی تھی۔ دو وقت گوشت روٹی میسر تھی۔ گھر میں ساز و سامان بھی تھا۔ لیکن گھر نہیں تھا۔ بیوی ناراض ہو کر میکے جا بیٹھی تھی۔ اور میں ضد کر کے بیٹھ گیا تھا کہ خود لوٹ آئے۔ منانے نہیں جاؤں گا۔

تین سال ہونے کہ ماں باپ نے میری شادی کر دی تھی۔ کلثوم بڑی اچھی لڑکی تھی۔ قبول صورت تھی دسویں پاس تھی۔ خدمت گزار تھی۔ لیکن دل کی بڑی کمزور تھی۔ چھوٹی سی بات پر آنکھیں بھر آتیں۔ گلو گیر ہو جاتی۔ پھر ٹپ ٹپ آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

ایک سال میں اتنی جھڑیاں لگیں کہ سارا گھر بھیگ گیا۔ اس پر میرے دل میں یہ

خواہش ابھری کہ باہر گھوم پھر کر خود کو سکھاؤں۔

میرے دوست کہتے ہیں۔ جامی، تم بڑے دل پھینک ہو. دل پھینک تو خیر زیادتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھ میں نسائی کشش کی حس کچھ زیادہ ہی ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ اس بارے میں میں نے بہت سوچ بچار کی ہے لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی۔

خوبصورت خواتین پاس سے گزرتی ہیں تو اندر سے ایک والہانہ "واہ" نکلتی ہے اور بس بات ختم ہو جاتی ہے۔ میں اپنے راستے پر چل پڑتا ہوں۔ میری راہ کھوٹی نہیں ہوتی۔

پھر ایک عام سی خاتون گزرتی ہے۔ پتہ نہیں اس کے انداز میں ایسی کیا بات ہوتی ہے کہ میں رک جاتا ہوں۔ ایسے لگتا ہے جیسے چلتے چلتے بلا گئی ہو۔ میری راہ کھوٹی ہو جاتی ہے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا ہوں۔

سچی بات یہ ہے کہ میں نے نسائی کشش کا بھید آج تک نہیں پایا۔

ایک ہی خاتون ایک وقت مجھے بھدی اور بے جان نظر آتی ہے دوسرے وقت وہی خاتون بڑی جاذب اور جاندار محسوس ہوتی ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں ہوتا ہے پر ایسا ہوتا ہے۔ ہوتا رہتا ہے۔

انہی دنوں گھر کی بھیگ سے اکتا کر میں گھومتا پھرتا ایک گلی میں جا نکلا۔ شام کا وقت تھا۔ دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ ایک خاتون مجھ سے چند قدم آگے چل رہی تھی۔ کالا لباس پہنا ہوا تھا. ارے میں چونکا۔ چال میں مستی بھری لے تھی۔ طبلے کے دونوں پڑے رقص میں تھے۔

دیر تک ہم دونوں چلتے رہے۔ پڑے بجتے رہے۔ پھر ایک دروازے پر وہ رک گئی۔ مڑ کر دیکھا۔ پھر اندر داخل ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے بلا گئی ہو۔

چار ایک دن میں اس گلی میں گھومتا رہا کہ شاید پھر نظر آئے۔ دیکھوں کیا چیز ہے۔

ایک دن میں دروازے کے پاس پہنچا تو وہ باہر نکلی۔

مجھے دیکھ کر رک گئی. بولی۔ آپ کسی کی تلاش میں ہیں کیا؟

ہاں میں نے جواب دیا۔ تلاش میں تھا۔ میں نے تھا پر زور دیا۔
وہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔ اب کیا ارادے ہیں؟
اتنی سنجیدگی اور بیباکی۔ میں گھبرا گیا۔
اچھا خدا حافظ۔ وہ بولی۔
کہاں جارہی ہیں؟ آپ میں نے پوچھا۔
میاں کی تلاش میں۔ وہ بولی۔
اگر ناگوار نہ ہو تو میرے ساتھ گاڑی میں چلئے۔
دور تو نہیں لے جائیں گے آپ؟
دور کہاں؟ میں نے پوچھا۔
جہاں لے کر جا کر مطالبہ کرتے ہیں کہ اتنا روپیہ دو اور لے جاؤ۔
میں ہنس پڑا۔ لیکن وہ سنجیدہ رہی۔
میری طرف دیکھئے۔ کیا میں دور لے جانے والا نظر آتا ہوں؟ میں نے کہا۔
نہیں۔ وہ بولی۔ آپ تو دور جانے والے دکھتے ہیں۔ لے جانے والے نہیں۔
موٹر میں بیٹھ کر بھی وہ بڑی سنجیدہ رہی۔ بالکل سوکھی۔ اس روز والی خاتون لگتی ہی نہ تھی۔ البتہ بڑی بے تکلف بات کرتی تھی۔ ذرا جھجھک نہ تھی۔
اس کے میاں قریب ہی مل گئے۔
بولی۔ یہ ہیں میرے میاں نجمی۔
نجمی چلایا۔ ارے یہ تو جامی ہیں۔ ہم تو ایک دفتر میں کام کر چکے ہیں۔ جامی یہ میری بیوی ہے مینا۔
وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ دیر تک ہم اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مینا کا رویہ ویسا ہی تھا۔ سنجیدہ بے تکلف پھر جب میں رخصت ہونے لگا تو مینا نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ میرا ان کے گھر نہ جانا ناممکن ہو گیا۔ وہ عجیب سی نظر تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ میری گود میں آبیٹھی ہو۔
میں نے ان کے گھر باقاعدہ جانا شروع کر دیا۔ وہ میری بڑی آؤ بھگت کرتے پھر کوئی نہ کوئی بات شروع ہو جاتی اور وقت کا پتہ ہی نہ چلتا۔

مینا میں تین باتیں بڑی جاذب تھیں۔ ایک تو اس کی ہر حرکت میں لے تھی۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر بات کرنے کی عادی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مقناطیسی طاقت تھی۔ یوں لگتا جیسے مسمریزم کر رہی ہو۔ ہو چند ساعت کے بعد وہ گردن کو جھٹکتی تھی۔ وہ جھٹک سیدھی دل پر لگتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں۔ پھر وہ نظر تھی۔ ہر ملاقات کے دوران دو ایک بار مجھ پر وہ نظر پھینکتی۔ اس قدر قریب آجاتی کہ اس کی سانس کی خشبو مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔

چند ملاقاتوں کے بعد مجھے پتہ چل گیا کہ مینا کا مقصد صرف یہ ہے کہ کوئی اس کی کھڑکی میں ٹنگا رہے اور وہ آتے جاتے اسے جھلاتی رہے۔ اپنا مقصد بھی تو یہی تھا۔ کہ جھولنا جھولتا رہے۔

روز گھر دیر سے جانے لگا تو کلثوم کو شک پڑ گیا۔ بار بار پوچھتی۔ بات کیا ہے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ میں اسے بڑے پیار سے سمجھاتا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن منہ زبانی سمجھانے سے کون سمجھتا ہے۔ اور پھر خاتون۔ خاتون ہونٹوں کی بات نہیں سنتی وہ تو آنکھ کی بات سن لیتی ہے۔ اور میری آنکھیں تو جھولنا جھول رہی تھیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں ایسی جھڑی لگی۔ ایسی جھڑی لگی جیسے سیلاب آگیا ہو۔ جوں جوں گھر کی بھیگ بڑھتی گئی توں توں مجھ میں خود کو سکھانے کا خبط بڑھتا گیا۔ جوں جوں مجھ میں سکھانے کا خبط بڑھتا گھر کی بھیگ بڑھ جاتی۔ ایک شیطانی چکر چل پڑا۔

بات یہاں تک بڑھ گئی کہ کلثوم نے پوچھنا چھوڑ دیا کہ بات کیا ہے۔

پھر ایک روز بات اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی مینا اور میں ایک سٹور میں شاپنگ کر رہے تھے کہ کلثوم نے ہمیں دیکھ لیا میں گھر لوٹا تو دیکھا کہ کلثوم سامان باندھے بیٹھی ہے۔ میں خاموش رہا جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے کہا۔ دیکھ، گھر چھوڑ کر جانے کی کوئی بات نہیں لیکن اگر تو چلی گئی تو میں منانے نہیں آؤں گا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد گھر میں ہم اکیلے رہ گئے۔ میں اور میرا نوکر فضلا۔ پھر مالک مکان نے نوٹس دے دیا اور ہم شام نواس میں آگئے۔ شام نواس میں آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مینا کے گھر کے قریب تھا۔ تین منٹ کا پیدل رستہ۔

شام نواس میں آئے ابھی ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ میرا نوکر فضلا منہ بسورتا ہوا میرے

پاس آیا۔ کہنے لگا صاحب جی، مجھے چھٹی دیدیں۔ میں تو گاؤں جاؤں گا۔

گاؤں کس لئے جائے گا تو؟ میں نے پوچھا۔

بولا۔ میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔

اس گھر میں کیا تکلیف ہے؟

کہنے لگا۔ یہاں آسمان جو نہیں دکھتا۔

میں ہنس پڑا۔ آسمان نہیں دکھتا تو پھر کیا ہوا۔

صاحب جی ہم پنڈو لوگ ہیں۔ وہ بولا۔ ہم تو آسمان کو دیکھ دیکھ جیتے ہیں۔

آسمان میں کیا دھرا ہے؟ میں نے پوچھا۔

آسمان میں آسمان والا جو ہے۔ وہ بولا۔ اسے دیکھ کر حوصلہ ہو جاتا ہے۔ گاؤں والے تو جی، اسی کے حوصلے پر جیتے ہیں جو وہ نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو۔

یہ مکان تو بہت اچھا ہے فضلے کھلا کھلا ہے۔ میں نے اس کی منت کی۔

جی۔ بڑا اچھا ہے۔ وہ بولا۔ پر بند بند ہے۔ اس میں "اس" کا آنا جانا نہیں ہے نا۔ جب آسمان ہی نہ ہو تو آسمان والا کیسے ہو۔ آپ کو نہیں پتہ صاحب جی آپ تو چلے جاتے ہیں۔ جب شام پڑتی ہے تو یہ گھر رونے لگتا ہے۔ بین کرتا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوتا ہے۔ جی بیٹھنے لگتا ہے۔ میں تو جی تالا لگا کر باہر گلی میں چلا جاتا ہوں۔ اس وقت مجھ سے یہاں بیٹھا نہیں جاتا۔

میں نے فضلے کو روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ نہ رکا۔ پھر اتفاق سے نجمی اور مینا کو دس دن کے لئے کراچی جانا پڑا تو شام نواس کے اثرات مجھ پر ظاہر ہونے لگے۔

سارا دن وہ مکان ٹھیک ٹھاک رہتا تھا۔ شام پڑتی تو گویا وہ جاگ اٹھتا۔

شام کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ شام پڑتی ہے تو اک بے نام اداسی چھا جاتی ہے۔ نبضیں مدھم پڑ جاتی ہیں۔ دل، یوں لگتا ہے جیسے ڈوبا ڈوبا سا ہو۔ حرکات میں شدت نہیں رہتی۔ پتہ نہیں کہاں سے ان جانا سا دکھ رستا ہے۔ میں نے تو یہ سمجھا ہے کہ شام وقت نہیں بلکہ ایک عالم ہے۔

پتہ نہیں راگ ودھیا والے شام کو کلیان کیوں سمجھتے ہیں۔ کلیان تو براہ بھری چیخیں ہیں۔ تیور سر چیختے ہیں۔ آگ لگا دیتے ہیں۔ نہیں شام۔ کلیان نہیں۔ چیخیں نہیں۔ آگ

نہیں شام تو مدھم دکھ ہے۔ آہیں ہے۔ آگ نہیں، سلگن ہے۔

پہلے دو ایک دن تو مجھے خیال نہ آیا۔ میں سمجھا شام کے اثرات ہیں۔ پھر دفعتاً میں نے سوچا کہ شام کے اثرات تو کھلے میں ہوتے ہیں۔ دیہات میں، میدانوں میں۔ کھلے بازاروں میں، گلیوں میں۔ بند گھروں میں تو نہیں ہوتے۔

جونہی شام پڑتی، شام نواس آہیں بھرنے لگتا۔ بے نام دکھ کونوں سے رس رس کر باہر نکلتا۔ بتیاں مدھم پڑ جاتیں۔ کونوں کھدروں سے ناامیدی اور مایوسی جھانکتی۔ چاروں طرف سے غم کی پھوار سی پڑتی اور وہ بھگو کر رکھ دیتی۔ پھر ایسا لگتا جیسے زندگی دکھوں کی پاؤں پڑی زنجیر ہو۔ ایک دن تو میں اس قدر متاثر ہو گیا کہ خواہ مخواہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس روز میں نے کلثوم کے والدین کے نام ایک خط لکھ دیا کہ کلثوم خواہ مخواہ ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔ ناراضگی کی کوئی بات نہیں۔ میں یہاں اکیلا ہوں۔ فضلا گاؤں چلا گیا ہے۔ کلثوم سے کہیں کہ آ کر اپنا گھر سنبھالے۔

جس روز کلثوم آئی اسی روز نجمی کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ تو آ گیا ہے لیکن مینا ایک مہینے کے لئے وہیں کراچی میں رک گئی ہے۔

کلثوم کے آنے کے بعد میں نے باہر جانا چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مطمئن ہو جائے گی۔

لیکن حال سے مطمئن ہونے کے باوجود وہ بار بار ماضی کو یاد کرتی اور چھم چھم آنسو بہاتی۔ ہے آپ نے کیا کیا ہے؟ مجھ سے ایسا سلوک کیوں کیا؟ وہ حرام زادی کون تھی؟ جس نے میری زندگی کا سکھ چین لوٹ لیا۔ وہ بار بار ماضی کی باتیں کرتی۔ گزری ہوئی باتیں یاد کرتی۔ انہیں پھر سے بتانا شروع کر دیتی اور چھم چھم روتی۔

شام پڑتی اور میں دفتر سے گھر آتا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ آواز گلوگیر ہو جاتی۔ رات بھر وہ آہیں بھرتی اور کروٹیں بدلتی رہتی۔ یہ دیکھ کر میں نے اسے نیند کی گولیوں کی شیشی لا دی۔ لیکن نیند کی گولیوں نے بھی کام نہ کیا۔ سارا دن وہ اونگھتی رہتی اور رات کو کروٹیں بدلتی رہتی۔

دو مہینے یوں ہی گزر گئے۔ گھر اتنا بھیگ گیا کہ چچ چچ کرنے لگا۔ میری تو جان عذاب

میں آ گئی۔

پھر ایک روز دفتر میں مجھے مینا کا خط ملا۔ لکھا تھا۔ مجھے پتہ ہے نجمی اور آپ اداس ہوں گے لہٰذا میں آ رہی ہوں۔ بدھ کے دن سات بجے کی فلائٹ سے۔

میں نے نجمی کو فون کیا اور پھر مینا کے خط کو دراز میں رکھ کر مقفل کر دیا تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔

اگلے روز کلثوم کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ نہ وہ میرے پاس آئی نہ آنسو بہائے بلکہ چپ چاپ بستر پر لیٹی رہی۔ اس تبدیلی پر میں بہت خوش ہوا۔

اگلی صبح میں نے اسے آواز دی مگر وہ چپ چاپ پڑی رہی۔ پھر جو میں نے اسے جھنجھوڑا تو پتہ چلا کہ وہ بے ہوش پڑی ہے۔ اتفاقاً میری نظر خواب آور گولیوں کی شیشی پر پڑی جو اس کے سرہانے میز پر پڑی رہتی تھی۔ شیشی خالی تھی۔ میں نے گھبرا گیا۔ موٹر میں ڈال کر ہسپتال لے گیا۔

دو روز وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑی رہی۔ لیکن جان بر نہ ہو سکی۔

اسے دفنا کر گھر واپس آیا تو دیکھا کہ اس کے سرہانے تلے ایک لفافہ پڑا تھا۔ میں نے لفافہ کھولا۔ ارے یہ مینا کا خط یہاں کیسے آ گیا۔ یہ خط تو میں نے دفتر کے دراز میں مقفل کیا تھا۔ دفتر گیا۔ دراز کھولا۔ خط دراز میں نہیں تھا۔

میں سٹپٹا گیا۔ یہ کیسے ہوا۔

نہیں نہیں۔ میں اس مکان میں نہیں رہوں گا. نہیں رہوں گا۔ ساری شرارت اس مکان کی ہے۔ اس نے میری پیاری معصوم بیوی کلثوم کو ہلاک کر دیا ہے۔ میرا گھر تباہ کر دیا ہے۔

میں سارا سارا دن مکان کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہوں۔ رات کو شام نواس میں آتے ہوئے مجھے خوف آتا ہے۔ رات کو ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔

ایک بوڑھا درویش میری طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔ یہ جانتا ہے. سب جانتا ہے۔ مانتا نہیں۔ میں چیخ مار کر جاگ اٹھتا ہوں۔

پھر مجھے وہم آتے ہیں۔ شک پڑنے لگتا ہے۔ کہیں یہ سب کچھ سوچے سمجھے پلان کا نتیجہ تو نہیں تھا۔

آدھے چہرے

"میں سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں سب سے اہم مسئلہ ایموشنل سٹرس اور سٹرین کا ہے" اسلم نے کہا" اگر ہم ایموشنل سٹرس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بہت سی کمپلیکشنز سے نجات مل سکتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے ٹرانکولائیزر قسم کی چیز" رشید نے پوچھا۔

"نہیں نہیں" اسلم نے کہا۔ "ٹرنکولائیزر نے مزید پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ ایلوپیتھی نے جو مرض کو دبا دینے کی رسم پیدا کی ہے اس سے امراض میں اضافہ ہو گیا ہے اور صرف اضافہ ہی نہیں، اس سپریشن کی وجہ سے مرض نے کیما فلاج کرنا سیکھ لیا ہے لہذا مرض بھیس بدل بدل کر خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اسرار کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے۔ تشخیص کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیوں طاؤس، تمہارا کیا خیال ہے۔" اسلم نے پوچھا۔

"میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں" طاؤس بولا۔ "ہمارا طریق علاج یعنی ہومیو پیتھی یقیناً روحانی طریقہ علاج ہے۔ ہماری ادویات مادے کی نہیں بلکہ انرجی کی صورت میں ہوتی ہیں۔ جتنی دوا کم ہو اس میں اتنی ہی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔"

"وہ تو ہے" عظیم نے کہا۔ "یقیناً یہ طریق علاج اپنی نوعیت میں روحانی ہے لیکن ہمارے پریکٹسنگ ہومیوپیتھس کا نقطہ نظر ابھی مادیت سے نکل نہیں سکا۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔"

"ڈاکٹر صاحبان!" رشید ہنس کر بولا۔ "آپ لاکھ کوشش کریں لیکن ایلوپیتھی کو ریپلیس نہیں کر سکتے۔"

"وہ کیوں؟" حامد نے پوچھا۔

"سیدھی بات ہے!" رشید نے جواب دیا، "آج کل مریض کیور نہیں چاہتا۔ وہ صرف ریلیف چاہتا ہے۔ کیور کے لئے صبر چاہئے، استقلال چاہئے۔ آج کل لوگوں کے پاس

اتنا وقت نہیں کہ وہ کیور کا انتظار کریں۔ بس ایک گولی ہو. ایک ٹیکہ لگے اور شام کو انٹر کان کی محفل میں شو آف کا موقعہ ہاتھ سے نہ جائے۔ "

"سچ کہتے ہو بھائی!" حامد نے آہ بھری۔

"اسلم صاحب! طاؤس نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی آئیڈنٹٹی کھو چکے ہیں۔ ماڈرن ایج کی یہ ایک ڈزیز ہے. کنسنحس ڈزیز"

"میں سمجھا نہیں!" حامد بولا۔

"میرا مطلب ہے آج کل کے نوجوانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کون ہیں۔ پتہ نہیں وہ چاہتے کیا ہیں۔ موومنٹ کے دیوانے تو ہیں۔ چلتے رہنے کا بھوت سوار ہے لیکن انہیں پتہ نہیں کہ ہم کیوں چل رہے ہیں۔ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ ہمارے نوجوان میڈ کراوڈ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کے فرد کو دبا رکھا ہے۔ بالکل ایسے جس طرح انٹی بائٹکس اندر کی بیماری کو دبا دیتے ہیں۔ وہ اکیلے ہونے سے ڈرتے ہیں"۔ طاؤس نے ایک لمبی آہ بھری اور گویا اپنے آپ سے بولا۔ "کاش کہ میں کوئی ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو سکتا۔ جو اندر کے فرد کو ریلیز کر سکتی۔ میڈ کراوڈ کی نفی کر سکتی۔ "

"ہوں۔ دلچسپ بات ہے" عظیم نے سوچتے ہوئے کہا "آپ کو اس کا خیال کیسے آیا؟" حامد نے طاؤس سے پوچھا۔

"دو سال ہوئے" طاؤس کہنے لگا۔ "جب میں نے پریکٹس شروع کی تو پہلا مریض جو میرے پاس آیا اس نے مجھ سے پوچھا۔ تھا ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے کہ میں کون ہوں"

"عجیب بات ہے!" رشید زیر لب بولا۔

"اور وہ مریض مکمل ہوش و حواس میں تھا کیا؟" اسلم نے پوچھا۔

"بالکل" طاؤس نے جواب دیا۔ "

"شاید ڈس بیلنسڈ ہو"! عظیم نے گویا اپنے آپ سے پوچھا۔

"بظاہر تو نہیں لگتا تھا۔" طاؤس نے جواب دیا۔

"حیرت کی بات ہے۔" رشید نے دہرایا۔ اس وقت یہ سب لوگ رشید کے

مکان سے ملحقہ لان میں بیٹھے تھے۔

در اصل رشید ہومیوپیتھی کا بہت دلدادہ ہے۔ ہومیوپیتھ ڈاکٹروں سے اس کے بڑے مراسم ہیں۔

اس روز اس نے چار ہومیو پیتھ ڈاکٹروں کو اپنے گھر پر مدعو کر رکھا تھا۔ غالباً کوئی تقریب تھی یا ویسے ہی۔

رشید خود ہومیوپیتھ نہیں تھا لیکن اسے ہومیوپیتھی کے کیسز سننے کا بڑا شوق تھا۔ بہر حال کھانا کھانے کے بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے سبز چائے پی رہے تھے کہ دور حاضرہ کی بات چل نکلی تھی۔

طاؤس کے اس کیس پر ڈاکٹر لوگ تو نہیں البتہ رشید بہت متاثر ہوا۔ اس کے اصرار پر طاؤس نے انہیں اس نوجوان کا واقعہ سنایا۔۔۔ طاؤس نے بات شروع کی۔

"ان دنوں میں نے نیا نیا مطب کھولا تھا اور مطب بھی کیا. میں نے گھر کے ایک کمرے پر بورڈ لگایا تھا اور وہاں چند ایک ضروری کتابیں اور دوائیں رکھ لی تھیں۔ "

شام کا وقت تھا میں اپنے مطب میں بیٹھا ایک رسالے کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دروازے پر ٹک ٹک کی آواز آئی۔ دیکھا تو دروازے پر ایک خوش پوش نوجوان کھڑا ہے۔ "میں اندر آ سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"تشریف لائیے" میں نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا۔ "بیٹھیے"

" آپ ہومیوپیتھ ہیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"جی!" میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کی شکل و شباہت ایک پریکٹیکل نوجوان جیسی تھی۔ سمارٹ. ذہین. مضطرب۔ شوخ. لاابلی. چمکتی آنکھیں. چوڑا منہ. لٹکتی مونچھیں اور سر پر بالوں کا ٹوکرا۔

" دراصل میں آپ سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں" نوجوان نے کہا۔

"پوچھیے" میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ غالباً اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات شروع کرے۔

پھر وہ ایک دم کہنے لگا۔ "میری ایک پرابلم ہے۔ جناب! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ

آیا میں حمید ہوں یا اختر ہوں۔ "

طاؤس رک گیا۔ حاضرین حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں ہاں" رشید بے صبرا ہو رہا تھا۔ یہ "کیا بات ہوئی بھلا میں حمید ہوں یا اختر"۔

طاؤس نے بات شروع کی۔ بولا۔ نوجوان کی بات سن کر میں گھبرا گیا۔ سمجھا، شاید اس کا ذہن گڈمڈ ہے لیکن میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا"۔ پھر نوجوان خود ہی بولا۔ " آئی ام ناٹ اے مینٹل کیس سر۔۔۔ میرا ذہن بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر دراصل مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے بات کروں۔ "

"یہ بتایئے کہ حمید کون ہے۔ اختر کون ہے۔ " میں نے پوچھا۔

"میں ہوں۔ میں حمید بھی ہوں، اختر بھی، میرا نام حمید اختر ہے۔ " اس نے کہا۔

تو کیا حمید اختر ایک ہی فرد کا نام ہے" میں نے پوچھا۔

جی "ایک ہی فرد کا۔ " اس نے جواب دیا۔

"پھر آپ نے یہ کیوں پوچھا کہ میں حمید ہوں یا اختر"

" میں نے بالکل ٹھیک پوچھا ڈاکٹر! یہی میری پرابلم ہے۔ لیکن میں اپنی پرابلم کسی کو بھی نہیں سمجھا سکتا۔ میں اس امید پر یہاں آیا تھا کہ شاید ہومیوپیتھی میں کوئی ایسی دوا ہو جو میری پرابلم کو حل کر سکے۔ لیکن اٹس نو یوز۔ " وہ جانے کے لئے مڑا۔ "معاف کیجئے میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔ "

" ذرا ٹھہریئے تو۔ بیٹھ جایئے " میں نے اٹھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"فائدہ" وہ بولا۔

"نقصان بھی تو نہیں۔ " میں نے جواب دیا۔

"جب میں اپنی پرابلم پیش ہی نہیں کر سکتا تو۔ "

"گولی ماریئے پرابلم کو۔ " میں نے کہا " آیئے اکٹھے بیٹھ کر چائے کا پیالہ پیتے ہیں۔ دنیا میں سب سے عمدہ دوا اکٹھے بیٹھ کر باتیں کرنا ہے۔ "

"لیکن آپ کا وقت" اس نے کہا۔

"بے فکر رہئے میں بالکل فارغ ہوں۔ " احمد دین! میں نے بآواز بلند اپنے ملازم کو پکارا۔ بھئی چائے لے آؤ" اس پر وہ نوجوان رک گیا۔
"بیٹھئے نا" میں نے نوجوان کو صوفے پر بٹھا دیا۔ "دیکھئے موسم کتنا خوشگوار ہے اور یہاں سے پہاڑوں کا منظر کتنا اچھا لگتا ہے۔" میں نے اس سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ دیر تک بیٹھے ہم دونوں چائے پیتے رہے۔ اس دوران میں دو ایک مرتبہ اس نے اپنی پرابلم کی بات شروع کرنے کی پھر سے کوشش کی۔ آخر میں نے اس سے کہا "حمید صاحب! آپ اپنی پرابلم پیش نہ کریں بلکہ اپنی آپ بیتی سنائیں۔ آپ کی پرابلم آپ ہی آپ باہر نکل آئے گی۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے مجھے اپنی کہانی سنانی شروع کر دی۔
کہنے لگا۔ "ڈاکٹر صاحب! میرا نام حمید اختر ہے لیکن گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں۔ ہم شہر کے پرانے حصے کوچہ قاضیاں میں رہتے ہیں۔ میرے آباؤ اجداد نہ جانے کب سے اس محلے میں رہتے ہیں۔ یہ محلہ ایک کوچہ بند محلہ ہے۔ میرا مطلب ہے چاروں طرف سے بند ہے۔ اندر جانے کے لئے ایک بہت بڑی ڈیوڑھی بنی ہوئی ہے۔ جانے آنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ محلے میں صرف قاضی آباد ہیں جو ایک دوسرے کے عزیز یا رشتہ دار ہیں"۔ وہ رک گیا اور کچھ دیر کے توقف کے بعد بولا۔
"آپ چونکہ شہر کے جدید حصے میں رہتے ہیں آپ نہیں سمجھ سکیں گے کہ محلے میں رہنے کا مطلب کیا ہے محلے میں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو جانتا ہے۔ جونہی آپ محلے میں داخل ہوتے ہیں، لوگوں کی نظریں آپ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ بولتا کس طرح ہے سر اٹھا کر یا نیوا کے لڑکیوں کی طرف کن نگاہوں سے دیکھتا ہے۔"
ہم لوگ جو پشتوں سے محلے میں رہتے آئے ہیں۔ محلہ ہماری ہڈیوں میں رچ بس گیا ہے۔ جونہی ہم محلے میں داخل ہوتے ہیں آپ آپ انکھیں جھک جاتی ہیں۔ گفتگو میں شوخی ختم ہو جاتی ہے۔ اندر کا غنڈہ پن دھل جاتا ہے۔ لڑکیاں نگاہ میں لڑکیاں نہیں رہتیں۔ بڑوں کے لئے ادب واحترام کا ایک خول چڑھ جاتا ہے۔
اگرچہ اب محلے میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ برقعے اتر گئے ہیں۔ لباس بدل گئے ہیں۔ کاریں آ گئی ہیں۔ ڈرائنگ روم سج گئے ہیں لیکن محلے والوں کا رخ نہیں بدلا۔

اگر بدلا بھی ہے تو یہ تبدیلی باہر تک محدود ہے۔ محلے میں داخل ہوتے ہی کایا پلٹ جاتی ہے۔ کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں ویسے ہی بے اختیاری طور پر۔

ہاں میں اس محلے میں پلا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ اور مجھے اپنی ماں سے محبت ہے۔ نہیں محبت نہیں عشق ہے عشق۔ میری ماں نے جتنی محبت مجھے دی ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ میں اپنی ماں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں ڈاکٹر!"

ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ جذباتی ہو گیا۔ طاؤس ایک ساعت کے لئے رک گیا۔ پھر بولا۔

"آپ کا باپ" میں نے اس سے پوچھا۔

"اب تو میرا باپ ایک اچھی خاصی نوکری پر ہے۔ پہلے وہ ایک معمولی سے عہدے پر کام کرتے تھے۔ آج کل تو ہمارا گھر ایک اچھا خاصا مڈل کلاس گھرانا ہے۔ اچھا گزارہ ہو رہا ہے۔ پہلے یہ بات نہ تھی بہت مشکل سے پورا ہوتا تھا۔

پھر ہم پر ایک مصیبت نازل ہو گئی۔ ابا بیمار پڑ گئے۔ وہ ایک عجیب سی بیماری تھی۔ انہیں ریڑھ کی ہڈی میں شدت کا درد اٹھتا تھا۔ ہم نے انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ ہسپتال والوں نے انہیں درد سے بچانے کے لئے نشے والے ٹیکے لگانے شروع کر دیئے۔ دو سال بعد وہ صحت مند ہو کر گھر آئے تو ان ٹیکوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ایڈکٹ ہونے کی وجہ سے ان کی نوکری چھوٹ گئی۔ بد مزاجی حد سے بڑھ گئی جیسے کہ ہر اس ڈرگ ایڈکٹ کی ہوتی ہے جس کے پاس نشہ پورا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔

اف۔ وہ چار سال ہم پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہماری ہڈیاں توڑ دیں۔ امی ،چھوٹی بہن اور میں پس کر رہ گئے۔ ہم تینوں نے مزدوروں کی طرح کام کیا۔ ریڈی میڈ کپڑے سیئے۔ بیچے۔ دیسی نائیوں کو سپلائی کرنے کے لئے فیس کریمیں بنائیں، تھیلے سیئے، سیلوفین کے لفافے بنائے۔ ان دنوں ہمیں کئی کئی روز فاقے آئے لیکن امی نے ابا کے علاج اور ہماری تعلیم کو ہر قیمت پر جاری رکھا۔ اگر امی نہ ہوتیں تو گھر کے پرخچے اڑ جاتے۔ امی ایک بہت بڑی عورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب!! اس نے ہم سب کا حوصلہ بندھائے رکھا۔ ہم میں مصیبتیں سہنے کی ہمت پیدا کی۔ ابا کی دیوانگی برداشت کی۔ خیر وہ دن بیت گئے۔ ابا کی وہ

عادت چھوٹ گئی اور پھر انہیں پہلے سے بھی بہتر ملازمت مل گئی۔ ایسی کہ ہم خاصے خوش حال ہو گئے ہیں۔

گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں. ڈاکٹر صاحب! کبھی کسی نے اختر کہہ کر نہیں بلایا محلے میں بھی مجھے سب حمید کے نام سے بلاتے ہیں۔ جب کوئی مجھے حمید کے نام سے بلاتا ہے تو آواز میرے کانوں سے داخل ہو کر گویا سیدھی دل میں پہنچ جاتی ہے اور میرے دل میں گھر اور محلے کی یادیں یوں جھن جھن کرنے لگتی ہیں جیسے ساز کی تاریں۔ گھر سے وابستہ جذبات ابھرتے ہیں۔ ادب، احترام، عجز، خدمت، برداشت ایک مٹھاس سی پیدا ہو جاتی ہے۔ میری گردن جھک جاتی ہے۔ نگاہیں بھیگ جاتی ہیں۔ منہ سے جی ہاں جی ہاں نکلتا ہے۔ ایک عجیب سا سرور. عجیب سا سکون۔ میں بیان نہیں کر سکتا. ڈاکٹر صاحب"! نوجوان نے جھرجھری لے کر کہا۔

"میں سمجھتا ہوں آپ کی بات کو" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے۔ جو پشت در پشت سے محلے میں رہتا آیا ہو ڈاکٹر!" نوجوان نے پھر بات شروع کی۔ "جب میں کالج میں داخل ہوا۔ ان دنوں ہماری گھریلو مصیبت نئی نئی ختم ہوئی تھی۔ محنت مشقت اور غربت کا دور دور ہوا تھا۔ کالج میں میرا جی چاہتا تھا کہ الٹی چھلانگیں لگاؤں. ہنسوں کھیلوں. قہقہے لگاؤں. اس کو چھیڑوں۔ اس سے الجھوں پھر وہاں محلے کی بندشیں بھی تو نہ تھیں۔ ایک عجیب سی آزادی کا احساس ہوا مجھے۔ مادر پدر آزاد پھر یہ بھی تھا کہ وہاں مجھے کوئی حمید کے نام سے پکارنے والا نہ تھا۔ پتہ نہیں کیسے وہاں کالج میں سبھی مجھے اختر کہہ کر بلاتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میں ایک نیا نکور نوجوان ہوں جسے حمید سے دور کا تعلق نہیں یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ کالج میں میں یوں تھا جیسے بوتل سے نکلا ہوا جن ہو۔

میں نے بال بڑھائے۔ مونچھیں لٹکالیں۔ جیکٹ اور جین پہن لئے۔ میرا بولنے کا انداز بدل گیا سوچنے کا انداز بدل گیا۔ جینے کا انداز یوں بدل گیا جیسے کوئی چت سے پٹ ہو جائے۔

ایک ہی سال میں میں کالج کی ہر اکٹوٹی میں پیش پیش ہو گیا۔ آزادی کے نعرے لگانے میں. پروفیسروں کا مذاق اڑانے میں. گرل سٹوڈنٹس کو چھیڑنے میں. گلیڈ آئی چمکانے

میں، چکیلی باتیں کر کے اپنی دھاک جمانے میں، سٹرائیک کرانے میں، جلسہ جلوس آرگنائز کرنے میں، ہاتھا پائی کرنے میں، لڑکیوں سے رومان لڑانے میں۔ میں ڈیبٹ کلب کا سیکرٹری بن گیا۔ سپورٹس میں کھلاڑی تو نہ بن سکا لیکن پنڈال میں کھڑا ہو کر جس کو چاہتا سپورٹ کر کے ہیرو بنا دیتا۔ جس لڑکی پر توجہ دیتا وہ ابھر کر کالج کی فضاء پر چھا جاتی۔ جس پارٹی کو چاہتا اسے کامیاب بنا دیتا جسے نہ چاہتا اسے یوں توڑ کر رکھ دیتا جیسے ہاتھ کا کھلونا ہو۔

یعنی تین سالوں میں اختر کالج کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ سب سے بڑا مُتلی بن گیا۔ ڈینڈی بن گیا۔

اب پروفیسر اس سے دبتے ہیں۔ لڑکے اس کے پیچھے چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لڑکیاں اس سے خائف ہیں۔ ساتھ ہی اس کی طرف کھینچی چلی آتی ہیں۔ بولتے بولتے نوجوان رک گیا۔

"اور۔ حمید؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"حمید!" وہ مسکرایا۔ حمید اپنی جگہ جوں کا توں قائم ہے۔ جب بھی اختر محلے میں داخل ہوتا ہے تو اس کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ اوپر سے اختر کا چھلکا اتر جاتا ہے اور نیچے سے حمید نکل آتا ہے۔ گردن جھک جاتی ہے۔ تنے ہوئے سینے میں لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ نگاہوں میں ادب اور لحاظ کا لگاؤ ابھر آتا ہے لڑکی کو دیکھ کر وہ مہتابی نہیں چھوٹتی جس سے کالج کی فضا تارے تارے ہوئی ہے۔ الٹا لڑکیاں ماں بہنوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں کے لئے وہ تحقیر نہیں رہتی بلکہ اس کی جگہ احترام اور ادب کا جذبہ ابھرتا ہے اور جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو ماں یوں نظر آتی ہے جیسے دیوی ہو اور اس کا جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو اٹھا کر دیوی کے قدموں کی بھینٹ کر دے"۔۔۔ نوجوان خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے پیار بھری پھوار نکل رہی تھی۔

دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آخر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ طاؤس نے کہا اور بن سوچے سمجھے ایک ایسا سوال کر دیا میں خود حیران رہ گیا۔ میں نے کہا آپ کو کیا یہ احساس شروع سے ہی تھا کہ حمید اور اختر دو مختلف افراد ہیں یا۔۔۔"

"نہیں۔ نہیں!" نوجوان نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اس کا

قطعی احساس نہیں تھا۔ اگر کل وہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید میں بے خبری ہی میں رہتا۔ ''

''کل دوپہر کے وقت کالج کے کھلے میدان میں ہم ایک بڑے فنکشن کا انتظام کر رہے تھے۔ اختر اس فنکشن کا ناظم بھی تھا اور روح رواں بھی اس وقت وہ لڑکوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ ہمارے محلے کا چچا غفورا وہاں آ گیا اس نے باآواز بلند آوازیں دینی شروع کر دیں۔ حمید حمید، اختر نے وہ آواز سنی بھی لیکن اس وقت اس کے لئے حمید کا کوئی مفہوم نہ تھا۔ پتہ نہیں حمید کون تھا۔

پھر لڑکوں نے شور مچا دیا ''بھئی اختر یہ صاحب کسی حمید کو پوچھ رہے ہیں۔ ''

''یہی تو اپنا حمید ہے'' چاچا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

دفعتاً میں نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے چچا غفورا کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اختر کا ذہن گڈ مڈ ہو گیا۔ شاید دھکا لگا۔ جب چچا نے بتایا کہ ماں بیمار ہے تو اختر کی نگاہ میں وہ میدان، وہ کالج اور وہ لڑکے سب دھندلا گئے۔ ایک خلا نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر حمید جاگ اٹھا۔ یوں جیسے بٹن دبانے سے بتی جل اٹھتی ہے۔ ''

نوجوان خاموش ہو گیا۔ کافی دیر خاموش رہا۔ پھر گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔ آج سارا دن میرے ذہن میں یہی سوال گھومتا رہا کہ میں کون ہوں اختر یا حمید پھر میری ہومیوپیتھک کتابوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میری ماں ہومیوپیتھی کی بڑی قائل ہے۔ یہاں سے گزر رہا تھا کہ آپ کا بورڈ دیکھ کر خیال آیا۔ کیوں نہ آپ سے پوچھوں کیا آپ کے ہاں کوئی ایسی دوا ہے جو میری اصلیت کو ظاہر کر دے۔ سامنے لے آئے تاکہ پتہ چلے کہ مجھے حمید بن کر زندگی گزارنی ہے یا اختر بن کر۔ یہ میری پرابلم ہے ڈاکٹر صاحب! کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ ''

نوجوان نے جلتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ طاؤس رک گیا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔

اسلم چھت کی طرف گھور رہا تھا۔ حامد ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی ٹیکے بیٹھا سوچ رہا تھا۔

عظیم بظاہر پھٹی پھٹی آنکھوں سے طاؤس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں نہ جانے کن خلاؤں میں بھٹک رہی تھیں۔ رشید منہ میں پنسل ڈالے بیٹھا تھا۔

"بڑا دلچسپ کیس ہے۔ " اسلم نے چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"اسے سبلٹ پرسینلٹی تو نہیں کہہ سکتے۔ عظیم بولا ڈول پرسینلٹی بھی نہیں "

"کیا یہ صرف حمید اختر کا خصوصی کیس ہے یا ہر ماڈرن نوجوان کا ابجیٹ کا جو پشتوں سے محلے میں رہتا آیا ہے۔ " حامد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ " طاؤس نے جواب دیا۔

"چھوڑو یار ان باتوں کو" رشید بولا۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے حمید اختر کو کیا جواب دیا؟"

"وہی جو معالج دیا کرتے ہیں" طاؤس نے جواب دیا۔ "میں نے کہا میں آپ کا کیس سٹڈی کروں گا۔ مجھے چار ایک دن کی مہلت دیجئے۔ " اس پر نوجوان اٹھ بیٹھا۔ میں پھر آؤں گا۔ شاید اتوار کے دن۔ امید تو ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ " یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

"کیا وہ اگلی اتوار کو آیا۔ " رشید نے پوچھا۔

طاؤس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یعنی بات ختم ہو گئی۔ "

"نہیں" طاؤس بولا۔ بلکہ بات شروع ہو گئی۔ "

"کیا مطلب" عظیم نے پوچھا۔

"میرے دل میں ایک سوال کھڑا ہو گیا۔ " طاؤس بولا کہ "اگر اس کیس کو ہومیو پیتھی نہیں حل کر سکتی تو ہومیو پیتھی کے قیام کا کوئی جواز نہیں"

"بالکل۔ " اسلم بولا۔ "ایسے کیس کو صرف ہومیو پیتھی ہی حل کر سکتی ہے۔ "

"اگر ہومیو پیتھی سپر سڈ سلف کو باہر نہیں لا سکتی تو یہ ہمارا قصور ہے، سسٹم کا نہیں۔ " طاؤس نے کہا۔ "اگر ہومیو پیتھی ہپو کریسی کی عادت کو توڑ نہیں سکتی تو یہ ایک افسوسناک بات ہے۔ قصور ہمارا ہے کہ ہم نے ہومیو پیتھی کو اس زاویئے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ میٹریا میڈیکا میں زیادہ تر سمپٹمز ایسے درج ہیں جو جسم نہیں بلکہ شخصیت کی حد میں آتے ہیں" طاؤس جوش میں آ گیا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے"۔ حامد نے کہا۔ "لیکن ہمیں یہ بتایئے کہ کیا مریض پھر کبھی آپ سے ملا۔"

"ہاں ملا۔" طاؤس نے بات شروع کی۔ "مگر اتفاقاً۔ تقریباً چھ مہینے بعد۔ اس روز میں اتفاقاً میونسپل پارک میں جا نکلا تھا۔ وہاں گھومتے پھرتے دفعتاً میں نے دیکھا کہ وہ اکیلا ایک بنچ پر بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے۔"

"ہیلو!" میں نے کہا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ "شاید آپ کو یاد نہ رہا ہو۔ میں طاؤس ہومیو پیتھ ہوں۔"

"اوہ" وہ اٹھ بیٹھا۔

"کہیئے۔ آپ وعدہ کے مطابق تشریف نہ لائے" میں نے پوچھا۔

"امی کی بیماری کی وجہ سے میں سب کچھ بھول گیا۔ ڈاکٹر" وہ بولا۔

"اب کیا حال ہے ان کا" میں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہو گئیں ہیں لیکن ڈاکٹر۔ میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔

"کیا ہوا" میں نے پوچھا۔

"مجھے کالج کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے ڈاکٹر" اس نے جواب دیا۔

آپ کا مطلب۔ اختر کو محبت ہو گئی ہے یا حمید کو۔"

"ہاں اختر کو" وہ ہنسنے لگا۔

"لیکن اختر اور محبت بے جوڑ بات ہے"

"ہاں ہاں" وہ چلایا۔ "اختر تو خود ایک بگڑا ہوا محبوب ہے۔ اسے محبت نہیں ہو سکتی تھی لیکن ہو گئی۔ ڈاکٹر۔ ہو گئی۔ پتہ نہیں کیسے پہلے تو اختر یہ سمجھتا رہا کہ محض دل لگی ہے۔ اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا۔ بہلاتا رہا۔ پھر۔۔۔"

"لیکن وہ لڑکی کون ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

کہنے لگا۔ "تھرڈ ایر کی لڑکی ہے۔ اس کا نام سنبل ہے۔ یہ بڑی عجیب و غریب لڑکی ہے ڈاکٹر! بڑی عجیب و غریب! جب وہ نئی نئی کالج میں داخل ہوئی تھی تو سب نے سمجھا تھا کہ وہ بہت ہی معصوم ہے۔ بات بات پر شرما جاتی تھی۔ اس کی شرماہٹ بہت ہی جاذب نظر

تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی پتلی دبلی. سمارٹ لڑکی ہے تیز. بہت تیز۔ گندمی رنگ. خدو خال تیکھے. سوئی کی طرح چبھ جانے والی لڑکی ہے وہ۔ "

"خیر صاحب" نوجوان نے پھر بات جاری کی۔ چند "ہی مہینوں میں سنبل نے پر پرزے نکال لئے اور لڑکوں کو پتہ چل گیا کہ وہ لجاتی شرماتی نہیں بلکہ شرماہٹ کو استعمال کرتی ہے اور ڈاکٹر! اسے شرماہٹ کو استعمال کرنا آتا ہے۔ لجالجا کر توجہ جذب کرتی ہے ایسے کہ میک اپ کیا کرے گا۔ جب شرماتی ہے. اس وقت اس کی پلکیں اڑتی تیتری کے پروں کی طرح پنکھی جھلتی ہیں. گال سرخ ہو جاتے ہیں. آنکھیں غروب ہو کر طلوع ہوتی ہیں پھر غروب ہو جاتی ہیں۔ باقی لڑکیوں کا انداز تو دھویا دھایا ہوتا ہے۔ میٹر آف فیکٹ قسم کا چونکہ وہ رومانٹک انداز کو رجعت پسندی کا نشان سمجھتی ہیں اور شرمانے کو نفرت کی آنکھ سے دیکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے سنبل کی اپیل انوکھی تھی۔ سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر پتہ چلا کہ سنبل بڑی حرام زادی ہے۔ وہ لڑکوں سے کھیلتی ہے۔ کھیلنے کا گر جانتی ہے۔ آج آپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ شرما شرما کر آپ کا برا حال کر دیا۔ کل آپ کو یوں نظرانداز کر دیا جیسے جانتی ہی نہ ہو۔

اس کا انداز کچھ ایسا ہے ڈاکٹر کہ جس کی طرف متوجہ ہو جائے وہ سمجھنے لگتا کہ میرے قابو میں ہے۔ قابو میں لانے کی کوشش کرو تو یوں انگلیوں سے پھسل جاتی ہے جیسے جیتی مچھلی ہو۔ ایک نگاہ ڈالئے تو اتنی قریب آ جاتی ہے کہ بس ہاتھ بڑھانے کی بات معلوم پڑتی ہے۔ دوسری نگاہ ڈالتی ہے تو کوسوں دور چلی جاتی ہے۔ بڑی چالاک ہے۔ وہ ڈاکٹر! لیکن ہے جادوگرنی۔ " نوجوان ہنسنے لگا۔

اس وقت اس کی آنکھوں سے پھوار سی نکل رہی تھی۔ یوں جیسے پھلجڑیاں چل رہی ہوں۔ ایک ساعت کے لئے وہ رکا پھر از خود بات شروع کر دی۔

قصہ مختصر یہ کہ چھ سات مہینے میں سنبل نے سب لڑکوں کو گھائل کر کے رکھ دیا لیکن کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ اس پر اختر کی انا جاگی۔ وہ سنبل کے قریب گیا۔ اسے جیتنے کے لئے نہیں بلکہ قابو میں لا کر دکھانے کے لئے۔ خیر دو چار روز تو سنبل نے وہ وہ نگاہ ڈالی کہ اختر پگھل کر رہ گیا۔ چھینٹے اڑنے لگے۔ پھر سنبل پیچھے ہٹ گئی اور اس نے "ذرا ہٹ کر چھلکو مسٹر" کا اندازہ اپنا لیا۔ بس کیا بتاؤں ڈاکٹر! اختر اور سنبل میں بڑی لڑائی ہوئی۔ گھمسان کا

رن پڑا۔ اختر بری طرح گھائل ہوا۔ اپاہج بن کر رہ گیا۔ "

میں نے اس کی بات کو ٹوک کر کہا۔ آپ تو کہتے ہیں وہ بڑی مکار ہے، چالاک ہے، حرام زادی ہے۔ پھر آپ کو اس سے محبت کیسے ہو گئی؟"

"اسی لئے ہوئی ڈاکٹر! وہ مکار ہے۔ چالاک ہے۔ حرام زادی ہے۔ اگر وہ سیدھی سادی معصوم لڑکی ہوتی تو میں اس سے کھیلتا اور پھر یوں پھینک دیتا۔ جیسے کھلونا ہو۔"

"اوہ یہ بات ہے!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا تو کیا آپ نے اظہار محبت کیا؟"

"پیشتر اس کے کہ اظہار کرتا" نوجوان نے جواب دیا۔ "ایک مشکل پڑ گئی۔ ویسے اظہار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسے سب پتہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میری کیا کیفیت ہے۔ اور یہ بھی کہ میں نے واپسی کی سب کشتیاں اپنے ہاتھوں سے جلا دی ہیں۔" وہ رک گیا۔

"ہاں تو وہ مشکل کیا تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دن امی نے مجھے بلایا۔ کہنے لگی "حمید تو نوشابہ کو جانتا ہی ہے"

نوشابہ امی کی واحد سہیلی تھی جس زمانے میں ہم پر مصیبت پڑی تھی۔ اس بھری دنیا میں نوشابہ ہماری واحد ہمدرد تھی۔ اس نے ہم پر بڑے احسان کئے تھے۔ میں ان احسانات کو اچھی طرح جانتا تھا۔

"ہاں امی۔ میں نوشابہ کو اچھی طرح جانتا ہوں"۔ میں نے امی سے کہا۔ امی بولی۔ "نوشابہ کے میاں فوت ہو چکے ہیں۔ اس کی اکلوتی بچی صفیہ اب جوان ہے۔ کالج میں پڑھتی ہے۔ خوش شکل ہے۔ سمارٹ ہے۔ ماڈرن بھی ہے لیکن سگھڑ اتنی، اتنی سلیقے والی، اتنی خدمت گذار کہ یوں لگتا ہے جیسے اسے اس زمانے کی ہوا بھی نہیں لگی۔ میں چاہتی ہوں بیٹے کہ اسے بہو بنا کر گھر لے آؤں۔ ارے تو تو گھبرا گیا۔ امی نے غالباً میری حالت بھانپ کر کہا۔ نہیں نہیں۔ کوئی زبردستی نہیں۔ اگر تیرا جی نہیں چاہتا تو نہ سہی ۔۔۔ یہ تو میری آرزو ہے۔ اگر تو مان جائے تو میری زندگی سپھل ہو جائے گی۔ سوچ لے۔ کوئی جلدی نہیں۔ سوچ کر مجھے بتا دینا۔"

"پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا۔" میں نے پوچھا۔

"فیصلہ" نوجوان ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی ٹوٹ کی آواز تھی۔ جس وقت سے امی نے شادی کی بات کی ہے، سنبل کے لئے میرا جذبہ یوں ابھر آیا ہے جیسے دودھ کی کڑاہی ہی پر ملائی آجاتی ہے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ سنبل سے مجھے لگاؤ ہی نہیں عشق ہے، عشق ہے۔ اس کے بغیر زندگی بے مصرف نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب! میں پھانسی پر لٹکا ہوا ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ امی کی خواہش پر میں اپنی ہر خواہش قربان کر سکتا ہوں لیکن اب ـ " نوجوان نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھر چپ ہو گیا۔

طاؤس نے چاروں طرف دیکھا۔

"کتنی انوکھی بات ہے" رشید بولا۔

"انوکھی تو نہیں" اسلم نے کہا۔ "عام سی بات ہے۔ ایسے واقعات روز ہوتے ہیں۔"

"ہاں تو پھر نوجوان نے کیا فیصلہ کیا؟" عظیم نے پوچھا۔

"ہماری وہ مختصر سی ملاقات تھی۔" طاؤس نے بات جاری کرتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں بنچ پر بیٹھے تقریباً ایک گھنٹہ باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ سخت کش مکش میں مبتلا تھا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ اس کے ذہنی کرب کو محسوس کر کے میں سخت گھبرا گیا اور اسے چھوڑ کر چلا آیا۔"

"ہاں!" اسلم بولا۔ "ذہنی کرب متعدی ہوتا ہے"

"اس کے بعد وہ نوجوان آپ سے ملا کیا؟" حامد نے پوچھا

"ہاں چھ مہینے بعد" طاؤس نے جواب دیا۔

"تو کیا اس نے آپ کو بتایا؟" ــ رشید نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں!" طاؤس نے پھر سے بات شروع کی۔ "اس روز میں سینما کا سپیشل شو دیکھنے گیا تھا۔ بڑی آؤٹ سٹینڈنگ پکچر لگی تھی۔

ہال میں میں خاصہ لیٹ پہنچا۔ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حمید اختر مجھ سے اگلی رو میں بیٹھا ہے اس کے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ نئی بیاہی ہوئی دلہن ہے۔ یعنی اس کی شادی ہو چکی تھی۔ میرے دل میں کھتر بھر

ہونے لگی کہ وہ لڑکی کون ہے۔ سنبل ہے یا صفیہ۔ سچی بات یہ ہے کہ فلم پر میری توجہ نہ جمی۔ بس یہی سوچتا رہا۔

پھر جب انٹرول ہوا اور حمید اختر باہر نکلا تو میں بھی پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔ اس نے جلد ہی مجھے دیکھ لیا۔ "ہیلو ڈاکٹر" وہ چلایا۔

"کہئے" میں نے انجان ہو کر پوچھا۔ آپ نے کوئی فیصلہ کیا؟۔"

"میری تو شادی بھی ہو گئی ڈاکٹر صاحب" وہ چلایا۔

"سنبل سے یا صفیہ سے" میں نے پوچھا۔ "مجھے ساری بات سنائیے۔"

اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ بولا "ڈاکٹر صاحب امی کی خواہش کو رد کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا اور امی سے کہہ دیا۔ امی میں وہاں بیاہ کروں گا جہاں آپ چاہتی ہیں۔ بس یہی میرا فیصلہ ہے۔"

پھر کیا تھا ڈاکٹر! امی نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات کی۔ اور اس طرح صفیہ سے میری شادی ہو گئی۔ پھر سہاگ کی رات جب میں نے صفیہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے سنبل بیٹھی ہوئی ہے۔"

"ارے" میرے منہ سے چیخ سی نکلی۔ طاؤس رک گیا۔

سبھی لوگ حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"صفیہ. سنبل نکلی۔ مطلب کیا ہوا۔" رشید چلایا۔

"مجھے تو ساری بات ہی گپ نظر آتی ہے۔" اسلم نے کہا

"آپ نے حمید اختر سے نہیں پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہوا۔" عظیم بولا۔

"ہاں پوچھا تھا" طاؤس نے کہا۔

"تو پھر کیا بتایا اس نے" رشید نے پوچھا۔

پوچھا تو حمید اختر نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب وہ ہی میری طرح حمید اختر تھی"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"وہ صفیہ سنبل تھی۔"

خوش وقتی

انگوری کا لوک میلہ کور کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ طبیعت بے زار تھی۔ گھر میں یوں پڑا تھا۔ جیسے دھوپ میں ساحل پر مگرمچھ پڑے رہتے ہیں۔ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ گھر میں ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ بیگم ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھی۔

بیگم بڑی خوبیوں کی مالک تھی۔ جاذب نظر تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ سوشل تھی۔ اپنے انداز اور گفتگو سے دوسرے کو مسحور کر لیتی۔ اور پھر اس کا تماشہ کرتی۔

ہم دونوں میں صرف ایک فرق تھا۔ میں گھر بیٹھو تھا. وہ میلہ لگانی اور میلہ گھومنی تھی۔ گھر میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ چلو باہر چلیں۔ آج ہوٹل میں کھائیں۔ کیوں نا پک انک ہو جائے۔ ذرا آؤٹنگ کر لیں۔ فنکشن میں تو جانا ہی ہو گا۔

میں نے اس کا ساتھ دینے کی بڑی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساتھ خود کو گھسیٹتا رہا۔ لیکن کب تک۔ آخر تھک کر بیٹھ گیا پھر ہمارے جھگڑے شروع ہو گئے۔ اسے میرا ساتھ دینے کا کبھی خیال ہی نہ آیا تھا۔ ازل سے وہ میری ساتھی نہ تھی۔ جگت ساتھی تھی۔ اس نے اس حقیقت کو جان لیا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا۔ برنی! کیا زندگی بھر مجھے ایک لاش کو اٹھائے رکھنا ہو گا؟ نہیں۔ مجھ سے نہ ہو سکے گا گڈ بائی"۔

تیسری بار فون کی گھنٹی بجی تو میں جان گیا کہ خود ایڈیٹر ہو گا۔ چونگا اٹھایا تو واقعی میں ایڈیٹر تھا۔ کہنے لگا "دیکھو! برنی لوک میلہ تمہارے سوا اور کوئی کور نہیں کرے گا"۔

جواب میں کچھ کہنا بے کار تھا۔

میں نے اسی لاش کو گھسیٹا اور اپنے سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل کو صاف کرنے لگا۔ بیچارا گھسا پٹا سائیکل تھا۔ پتہ نہیں انگوری تک ساتھ دے گا یا نہیں۔

وہی بات ہوئی جس کا مجھے ڈر تھا۔ ڈوے ہوم کے سامنے بریک جام ہو گئی۔

ہوٹل سے پوچھا۔ "کوئی مستری ملے گا"؟

ریسپشن نے کہا۔ "ساری سر! مستری چھٹی پر گیا ہوا ہے"۔

شام اپنے بال کھول رہی تھی اندھیرا گاڑھا ہوتا جا رہا تھا مجبوراً مجھے رات کاٹنے کے لئے مُڈوے میں ٹھہرنا پڑا۔

"سنگل روم"؟ میں نے ریسپشن سے پوچھا۔

"سوری سر صرف ایک ڈبل روم خالی ہے"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ٹھہرنا تو پڑے گا ہی مجبوری ہے۔

"میں کمرے کو دیکھ سکتا ہوں کیا"؟ میں نے پوچھا

"سرٹن لی سر"

کمرا دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔ صاف ستھرا۔ ضروریات سے لیس اور دوسرے کمروں سے ہٹ کر الگ۔

"ٹھیک ہے"۔ میں نے بیرے سے کہا "اوکے"۔

"سر آپ اسے ڈبل کرنا پسند کریں گے"؟ بیرے نے زیرِ لبی میں کہا۔

"ڈبل کرنا"۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔

"ڈبل بیڈ جو ہے یہ کمرا"۔ وہ مسکرایا۔

"اوہ ـــــ بات سمجھ میں آ گئی"۔

"اس کا بھی انتظام ہے کیا" میں نے شرارتاً کہا۔

"اے کلاس سر" وہ بولا۔

مجھے شرارت سوجھی۔ "ایک شرط پر"

"جی سر"

"پسند نہ آئی تو واپس"

"اوکے سر" بیرا چلا گیا۔

میں نے سوٹ اتارا۔ رات کے کپڑے پہنے. منہ ہاتھ دھویا اور لیٹ گیا۔

رات کے دس بجے کے قریب دروازے پر ناک ہوا۔ "کم ان" میں نے کہا۔

دروازہ کھلا۔ بیرے کے ساتھ وہ اندر داخل ہو گئی۔

"تشریف رکھئے" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو بیرا" میں نے کہا "باہر دروازے پر انتظار کرو" یس سر کہہ کر بیرا چلا گیا

میں نے خاتون کا جائزہ لیا۔ میک اپ بہت ہلکا تھا۔ بناوٹ سجاوٹ نہیں تھی۔ لباس لاؤڈ نہ تھا۔ عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ کال گرل والی کوئی بات نہ تھی۔ انداز سوبر تھا۔ "ذرا میری طرف دیکھئے" میں نے خاتون سے کہا۔

اس نے گردن اٹھائی پھر اسے گھمانے لگی جیسے ماڈل گرل ہر زاویئے سے خود کو دکھاتی ہے۔ پھر وہ اٹھ بیٹھی۔ "آپ جسم دیکھنا پسند کریں گے سر" یہ کہہ کر وہ جسم کے زاویئے دکھانے لگی۔ پھر میری طرف دیکھ کر طنزاً بولی۔ "او کے سر"؟ ۔ اس کی آنکھوں میں ٹین ایج قسم کی چمک لہرائی۔ ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔

"بیرا" ۔ میں نے آواز دی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ "او کے بیرا" میں نے کہا۔

"تھینک یو سر" وہ بولا۔

"بیرا" خاتون نے اسے آواز دی۔

"یس میڈم"

"دروازے کے باہر انتظار کرو۔" وہ بولی

ارے یہ بیرے کو کیوں روک رہی ہے ۔ میں نے سوچا۔ "میری طرف دیکھئے پلیز" ۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

وہ میرا جائزہ لینے لگی۔ "اف یو ڈونٹ ملنڈ سر ذرا کھڑے ہو جایئے" ۔ میری توہین کر رہی ہے یہ عورت۔ مجھے غصہ آ گیا۔ "آپ کا مطلب کیا ہے میڈم" ۔ میں نے پوچھا۔

اس نے میری بات کو نظر انداز کر دیا۔ پھر باآواز بلند بولی ۔ "بیرا۔ ریسپشن سے بولو۔ آئی ایم ناٹ اینگیجڈ" ۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ساری سر" وہ بولی۔ دش یو ہیپی ڈریم گڈ نائٹ" ۔

"ذرا رکئے" ۔ میں چلایا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے ۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا" "سمپل میٹر" وہ بولی۔ "مجھے کسٹمر پسند نہیں ہے"

"لیکن بک تو میں نے کیا ہے آپ کو۔ آپ تو کال گرل ہیں"۔ میں نے غصے سے کہا۔

"غصے میں نہ آنا پلیز" وہ بولی۔ "مرد ریجیکٹ کرنے کا عادی ہے"۔

"ریجکٹ ہونے کو برداشت کرنا بھی سیکھئے"۔ "بے شک میں کال گرل ہوں"۔ لیکن ہوٹل والوں سے میرا معاہدہ ہے کہ اگر کلائنٹ پسند نہ آئے تو مجھے ریجکٹ کرنے کا اختیار ہو گا"۔ وہ پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے پلنگ سے چھلانگ لگائی اور دروازہ بلاک کر کے کھڑا ہو گیا۔

"معاف کیجئے گا محترمہ بے شک آپ مجھے ریجکٹ کیجئے لیکن میرے ساتھ دو ایک منٹ بیٹھئے تو۔ پلیز"

وہ مسکرائی اور پھر بیٹھ گئی۔

"مجھے بتایئے تو میں کس لحاظ سے آپ کو ناپسند ہوں"؟ "دیکھئے صاحب" وہ بولی۔ "پسند اور ناپسند کے پیچھے کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ دلیل نہیں ہوتی۔ بس آپ مجھے پسند نہیں ہیں"۔

"آخر تھوڑا سا اتا پتا تو بتایئے"۔ میں نے منت کی۔

"شاید اس لئے کہ آپ کی چند باتیں میرے خاوند سے ملتی جلتی ہیں"

"آپ شادی شدہ ہیں کیا"؟ میں نے پوچھا۔

"تھی"۔ وہ بولی۔ "پھر علیحدگی ہو گئی"

"آپ کا نام پوچھنے کی اجازت ہے کیا"؟

"خوش وقتی"۔ وہ بولی۔

"کیا کیا کیا۔ عجب نام رکھا ہے آپ کے والدین نے"۔

والدین نے نہیں رکھا"۔ وہ بولی۔

"تو پھر"

"آپ نے رکھا ہے"؟

"میں نے"

"ہاں۔ آپ کے بھائی بندوں نے۔ آپ کی قوم نے"

"آپ نے یہ نام منظور کر لیا ہے کیا" ؟

"مجبوری۔ کرنا پڑا۔ مرد کی نگاہ میں عورت خوش وقتی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ سب عورتیں اس حقیقت کو جانتی ہیں لیکن جاننا چاہتی نہیں۔ تکلیف دہ بات ہے نا اس لئے اب مجھے اجازت دیجئے" ۔

"پلیز کچھ دیر اور بیٹھئے۔ بے شک آپ ایگجڈ نہیں ہیں۔ ملاقاتی کی حیثیت سے بیٹھئے۔ کافی کا ایک گرم پیالہ۔ نہ نہ کیجئے. پلیز میرا جی چاہتا ہے کہ آپ سے باتیں کروں۔ صرف باتیں، سمپل ٹاک،

"ہاں"

وہ بولی۔ مرد ہمیشہ باتوں سے بات شروع کرتا ہے۔

"سمپل ٹاک۔ نہیں نہیں" ۔ میں چلایا

"اور عورت اس کے نہیں نہیں کو سچ مان لیتی ہے" ۔ وہ بولی۔ بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔

"دیکھئے میڈم! میرا نام حسن برنی ہے۔ صحافی ہوں۔ انگوری میں جو لوک میلہ ہو رہا ہے. اسے کور کرنے جا رہا تھا۔ یہاں پہنچا تو بریک جام ہو گئی اور مجھے یہاں رکنا پڑا۔ میں کال گرل بک کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ نہ ہی افورڈ کر سکتا ہوں۔ پتہ نہیں بیرے نے کیسے مجھے پھانس لیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ قدرت نے یہاں میرے لئے ایک ہیڈلائن سٹوری کا اہتمام کر رکھا ہے۔

"میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی جان لیا تھا کہ آپ کال گرل تھیں نہیں ہیں" ۔ اس نے جواب دیا۔

"کیا اسی وجہ سے مجھے ریجکٹ کیا گیا ہے" ؟۔

"سارے مرد اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ عورت محض ایک جسم ہے کو ملاپ کا طالب ہے" ۔

عین اس وقت بیرا کافی لے آیا۔

کافی پیتے ہوئے میں نے بڑی منتوں سے اسے خوش وقتی کی کہانی سنانے پر رضامند کر لیا۔

کہنے لگی. یہ کہانی ایک عام سی کہانی ہے۔ جو گھر گھر بیتی جا رہی ہے۔ سارا قصور تعلیم کا ہے۔ اگر وہ مجھے کالج نہ بھیجتے تو میں سکھی رہتی۔ خوش وقتی بن کر زندگی گزارنے کو اپنی تذلیل نہ سمجھتی۔ جب میں کالج میں داخل ہوئی۔ تو وہ رضی بن گئی۔ کالج میں آزادی ہی آزادی تھی۔ گھر میں پابندی ہی پابندی۔ کالج میں ہو کیئرز تھا گھر میں جی ہاں۔ ہاں جی۔

"پھر میری شادی ہو گئی"

"مرضی کی شادی یا۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"ہونے والا میاں مجھے دکھا دیا گیا تھا۔ وہ بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ جاذب نظر تھا۔ خوبصورت تھا۔ شریف آدمی تھا"۔

"کیسے پتہ چلا کہ شریف ہے" میں نے پوچھا۔

"اس کی آنکھ میں چھیڑ نہیں تھی۔ وہ اکاؤنٹس مین تھا۔ سی اے۔ اچھے عہدے پر فائز تھا۔ معقول تنخواہ تھی"۔

اس نے کافی کی دو چسکیاں لیں پھر کہنے لگی۔ "ان دنوں مجھے علم نہ تھا کہ اکاؤنٹ مین کیا ہوتا ہے"۔

"کیا ہوتا ہے اکاؤنٹس مین"۔ میں نے پوچھا۔

"دو اور دو چار ہوتا ہے اور بس۔ پروفیشن ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے ہندسے ناچتے رہتے ہیں۔ سر میں مگرین ہوتی ہے آنکھوں پر سبکس"۔

"واہ کیا تصویر کھینچی ہے"۔ میں نے کہا۔

"میرے میاں کا یہی حلیہ تھا۔ اس کے ذہن پر ہر وقت پروفیشن سوار رہتا۔ اول تو دفتر سے بہت لیٹ آتا۔ گھر آ کر بھی وہ دفتر ہی میں رہتا تھا۔ اس کے لئے گھر اور میں دونوں پس منظر تھے۔ ہم کبھی پیش منظر نہ بنے تھے"۔

"مگرین کی وجہ سے وہ جلدی سو جاتا تھا۔ خراٹے بہت لیتا تھا۔ آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اور وہ میرے پاس آ جاتا۔

اس وقت وہ ادھ سویا ادھ جاگا ہوتا۔ پھر کسی تمہید کے بغیر۔ بات چیت کے بغیر مجھے جگائے بغیر، چھیڑے بغیر، اپنا جسمانی تناؤ جھاڑ کر اپنے پلنگ پر لوٹ جاتا۔ اور پڑتے ہی

خراٹے لینے لگتا"۔

"میں چھڑ جاتی۔ ساری ساری رات چھڑی رہتی۔ آپ نہیں جانتے کہ چھڑ جانا اور پھر اکیلے پڑے رہنا عورت کے لئے کتنا بڑا عذاب ہے۔ میں سوچتی یہ کیسا ملاپ ہے جیسے ہم دونوں حیوان ہوں۔ کیا میاں کو احساس نہیں کہ ملاپ تو ایک بوٹے کی طرح ہوتا ہے۔ پہلے بیج ڈالا جاتا ہے۔ وہ پھوٹتا ہے۔ ٹہنیاں نکلتی ہیں پتیاں بنتی ہیں پھر کہیں جا کر پھول نکلتا ہے۔ پھول تو اہم نہیں ہوتا. شاخیں اور پتیاں اہم ہوتی ہیں باتیں اہم ہوتی ہیں۔ جذبہ اہم ہوتا ہے۔ اظہار اہم ہوتا ہے۔ ملاپ میں تو سفر اہم ہوتا ہے. منزل نہیں۔ کیا سارے مرد پہنچے کے بھوکے ہوتے ہیں۔ راہ چلنے کی اہمیت سے بے خبر ہوتے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی جیسے یادوں میں کھو گئی ہو۔ کچھ دیر وہ خاموش رہی

ہوں۔۔۔ تو پھر میں نے اسے جھنجھوڑا

"ہاں" وہ بولی۔ "شادی کے بعد چند مہینے تو میں یہ عذاب سہتی رہی۔ پھر میں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا اور ہمارے جھگڑے شروع ہو گئے۔ میں نے میاں کو بہت سمجھایا کہ دیکھ ہم دونوں جیون ساتھی ہیں۔ جگ جگ کے ساتھی۔ مجھے خوش وقتی نہ سمجھ۔ میری تذلیل نہ کر۔ سمجھا سمجھا کر تھک گئی پر ان پر اثر نہ ہوا۔

پھر میں نے ایک خوفناک ارادہ کر لیا۔ میں نے میاں کے نام ایک خط لکھا کہ میں خوش وقتی کا رول ادا نہیں کر سکتی اس نے گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ اگر آپ کبھی مجھے جیون۔۔۔ ساتھی کا مرتبہ دینے کے لئے تیار ہوں تو مجھے گھر واپس آنے میں خوشی ہو گی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں حیران رہ گیا اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ "کم ان" میں نے کہا۔ بیرا اندر داخل ہوا۔ "ایکسکوزمی میڈم" وہ بولا۔ آپ کے لئے ایک انگیجمنٹ ہے" ریسپشن سے رابطہ کریں۔

"ریسپشن سے بولو کہ میں انگیجڈ نہیں ہوں"۔ وہ بولی۔ "پر میں کام نہیں کروں گی"۔ بیرے کے جاتے کے بعد اس نے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔ آہ بھر کر بولی۔ "میں کراچی چھوڑ کر لاہور چلی گئی۔

لاہور میں بڑی آسانی سے مجھے ایک فرم میں جاب مل گئی۔ بہت خوش ہوئی۔ لیکن

اگلے روز ہی بھید کھل گیا۔ صاحب کے چپڑاسی نے بڑے رازدارانہ انداز سے مجھے بتایا۔ کہنے لگا۔ میڈم، صاحب کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ تھک کر چور ہو جاتے ہیں۔ اگر جو کبھی کبھی آپ ان کی تھکاوٹ کو دور کر دیا کریں تو۔۔۔ مسکرا کر اس نے اپنا جملہ پورا کر دیا۔

دو دن میں سوچتی رہی۔ پھر خیال آیا۔ ہٹاؤ ان سوچوں کو۔ اپنے میاں کے لئے بھی تو خوش وقتی تھی۔ یہاں دفتر میں بھی خوش وقتی رہو گی۔ جہاں جاوگی خوش وقتی سمجھی جاؤ گی۔ اب اس بات کو سچے دل سے مان لے کہ مرد کے لئے تو خوش وقتی کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

پورے ایک سال کے بعد میاں مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے دفتر آ پہنچے۔ بولے۔ "میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں۔ چلو گھر چلو۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے"۔ اس پر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتی، اسی روز ہم دونوں بائی ایر کراچی آ گئے۔

گھر میں میرے میاں کے ساتھ ان کی نوجوان بہن رہتی تھی۔ شام ہوئی تو میاں بولے۔ بھئی "اس ملاپ کو سیلی بریٹ کرنا چاہئے۔ چلو بیچ پر چلیں"۔ ہم تینوں بیچ پر چلے گئے بیچ ویران پڑی تھی۔ بیچ ہوٹل کے بیرے سے پوچھا کہ بات کیا ہے۔ وہ بولا۔ "آجکل کراچی غنڈا گردی کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے۔ لوگ باہر نہیں نکلتے۔ ڈرتے ہیں۔ جس کا کباڑا ہو گیا ہے"۔

عین اس وقت ایک جیپ آ گئی۔ ہوٹل بائے ڈر کے مارے دوڑ کر اندر چلا گیا۔ جیپ سے چار آدمی نکلے۔ سیدھے ہماری طرف آئے۔ ایک کے ہاتھ میں کلاشن کوف تھی۔ میرے میاں سے کہنے لگے دیکھو تمہارے پاس دو ہیں ایک ہمیں دے دو۔ ہم بھی پک نک پر آئے ہوئے ہیں۔ ہمارا بھی گڈ ٹائم ہو جائے۔

میرے میاں کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے لپک کر اپنی بہن کا بازو پکڑ لیا۔

"جلدی کرو" غنڈے نے کہا۔ "کون سی والی دو گے"؟

میرے میاں نے جواب میں بہن کو قریب تر کھینچ لیا۔

یہ دیکھ کر میرے اندر ایک دھماکہ ہوا۔ سب کچھ ٹوٹ گیا۔

چور چور ہو گیا

میں دیوانہ وار آگے بڑھی۔ چلئے میں نے چیخ کر ہائی جیکر سے کہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے چلئے نہیں کہا تھا بلکہ ایک دل دوز چیخ ماری تھی۔

اگلے روز جب میں جاگی تو میری نظروں میں ساری دنیا بدلی ہوئی تھی۔ کوئی چیز بھی ویسی نہ رہی تھی جیسی پہلے تھی۔

میرے اندر سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ چکنا چور ہو گئی تھی۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے پکارا۔ یا اللہ! تو نے تو ہمیں خوش وقتی نہیں بنایا تھا۔ تو نے تو ہمیں عزت دی ہے۔ لیکن یہ تیرا نام لینے والے......

پتہ نہیں میں کتنی دیر روتی رہی۔

پھر میرے اندر ایک سور نے تھوتھنی نکالی۔

ہاں میں خوش وقتی ہوں۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ اور میں نے مڈوے ہوم میں جا کر خود کو رجسٹر کرا دیا۔

اس نے ایک لمبی آہ بھری او دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔

کمرے پر خوفناک خاموشی طاری ہو گئی۔

"میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں کیا"؟ میں نے زیر لبی میں کہا۔

اس نے سر اٹھایا۔

"کیا آپ کال گرل بن کر مرد سے انتقام لے رہی ہیں"؟ میں نے پوچھا۔

"شاید" وہ بولی۔

"محترمہ۔ آپ مرد کے دل میں خوش وقتی کے جذبے کو شہہ دے رہی ہیں۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے نہیں پتہ میں کیا کر رہی ہوں۔ اور آئی ڈونٹ کیئر"۔ وہ دروازے کی طرف چل پڑی۔

"ٹھہریئے" میں چلایا۔ میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ آؤں"۔

کاریڈار میں ہم دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

ہوٹل گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی۔ جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہونے لگی تو میں نے کہا۔ "ذرا رکیئے"۔ وہ رک گئی۔

"کیا آپ میری جیون ساتھی بنیں گی" ؟ میں نے کہا۔ "لیکن میں اپنی بات پر خود حیران رہ گیا"۔

"جیون ساتھی" ؟ اس نے حیرت سے دھرایا۔ سر اٹھایا۔ میری طرف دیکھا۔ پھر ایک بھیانک آواز آئی۔ جا جھوٹھیا۔ ساتھ ہی ایک زہر خند ہسٹیرک قہقہہ گونجا۔

ریسپشن والے باہر نکل آئے۔ یہ چیخ کس نے ماری۔ کون ہلاک ہو گیا ہے۔

پھیلاؤ کی زیر لبی

اخبار کے تلاش گمشدہ کے کالم میں اپنی تصویر دیکھ کر سید اکبر چونکا۔ اس نے دو تین بار غور سے اشتہار کو پڑھا۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

سامنی کرسی پر اس کی بیوی رئیسہ آ بیٹھی۔ گلابی جسم اور ریشمی پیراہن سے کرسی لبالب بھر گئی۔ خشبو کا ایک لپٹا آیا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ سید! "اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔

سید اکبر نے گھبرا کر نگاہیں پھیر لیں دوسری جانب نوراں اس کے پلنگ کی پائنتی کے پائے سے لگی بیٹھی تھی۔ اشارے کی منتظر۔ جذبہ خدمت میں بھیگی ہوئی۔

"ادھر دیکھو" رئیسہ بولی۔ یہ گنوار لوگ، یہ ویرانہ گھر چھوڑ کر، یہ تم کہاں آ بیٹھے ہو"۔

پھر اس کی بیٹی پونی ٹیل جھلاتی ہوئی آ گئی۔ "ڈیڈی ایم بورڈ ٹو ڈیتھ۔ کم ہوم ڈیڈی"۔

اس کے پیچھے عاصم تھا۔ وہ غصے میں چلا رہا تھا۔ "ڈیڈ واٹ از دس نانسنس۔ ہو یو گان آؤٹ آف مائنڈ۔"

گھر کی یادوں نے سید اکبر پر یورش کر دی۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھار ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے۔

سید اکبر کی زندگی میں بیٹھے بٹھائے بلاوجہ ایسا ہو گیا۔

شاید یہ شام کی شرارت ہو۔ شام وقت نہیں ہوتا ایک عالم ہوتا ہے۔ ایک پر اسرار فضا۔ ایسے جیسے کسی اکیلی دکھی ودھوا نے بال کھول دیئے ہوں۔ جیسے وداع بے آواز گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ جیسے کسی بے نام اداسی نے چاروں طرف تنبو تان دیا ہو۔

وہ ایک ایسی ہی شام تھی۔ بھیگی بھیگی۔ سسکتی شام۔ اس شام کو سید اکبر نے اپنے گرد چاروں طرف دیکھا۔ اور دفعتاً محسوس کیا کہ یہ سب تو کچھ بھی نہیں۔

حالانکہ اسے گرد و پیش سبھی کچھ تھا۔ سبھی کچھ۔ ریشم سے لدی ہوئی۔ سونے سے پھندی ہوئی پاوڈر سرخی سے تھپی ہوئی۔ ممتاز محل کی طرح تحکم پلستر کی ہوئی۔ اچ نکی بیگم۔

ذہین، سمارٹ، بے چین، ہو کیرز ٹائپ، بگڑے ہوئے دو نوجوان بیٹے۔

لڑکے اور لڑکی کے درمیان لٹکی ہوئی ایک بیٹی ۔ پھلوں، کریموں، جوسوں اور فاسٹ فوڈز سے لدے ہوئے فرج اور ڈیپ فریزرز، کاروں سے لبالب دو گراج، نوکروں سے بھری ہوئی انیکسی، طرح طرح کے کھانوں کی خشبو سے بھرا ہوا کچن، دعوت زدہ ڈائننگ روم، وزیٹرز کی آمدورفت کا عادی ڈرائنگ روم۔

اس کے گرد و پیش اتنا کچھ تھا۔ کیا نہ تھا۔

سید اکبر ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ سلف میڈ۔

اس کی کامیابی زور بازو کا نتیجہ تھی۔ زور بازو کا نتیجہ ہو تو بازو اکڑ جاتا ہے، گردن تن جاتی ہے، چہرے پر کلف لگ جاتا ہے، یہ بات بھول جاتی ہے کہ بیسیوں بازو زور لگاتے ہیں۔ لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن زور لگتا نہیں۔ یہ احساس نہیں ہوتا کہ زور بازو میں صرف بازو کا زور نہیں ہوتا زور بازو کا احساس اللہ سے بے نیاز کر دیتا ہے خود کو خدا بنا دیتا ہے۔

سید اکبر جب گرد و پیش پر نظر ڈالا کرتا تھا تو تفاخر سے اس کی گردن تن جاتی۔ اس باغ کا وہ واحد مالی تھا۔

اس نے بنجر زمین پر گلستان تخلیق کیا تھا۔ اس تخلیق کاری پر وہ اپنے ہاتھ چوما کرتا تھا ۔ لیکن اس شام کو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ سب تو کچھ بھی نہیں۔ یہ خیال اس کے ذہن پر بجلی کی طرح کوندا۔ لیکن بجلی کی طرح معدوم نہ ہوا۔ الٹا قیام پکڑ گیا۔ یوں قائم ہو گیا جیسے تیل کی دھار قائم ہو جاتی ہے۔

چالیس سال پہلے جب وہ لٹا پٹا پاکستان آیا تھا۔ تو اک عام سا نوجوان تھا۔ کھاتے پیتے باعزت گھر کا نوجوان۔ جس کے پاس دو بازوؤں کے سوا کچھ نہ تھا

یہاں آتے ہی وہ محنت و مشقت میں جت گیا۔

پہلے اس لئے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے پھر اس لئے کہ گزارہ ہوتا رہے۔ گزارہ ہونے لگا تو بھی وہ محنت میں لگا رہا۔ اس لئے کہ آرام دہ زندگی میسر ہو۔ آرام دہ زندگی میسر ہو گئی تو وہ اور بھی شدت سے کام کرنے لگا کہ سٹیٹس حاصل ہو۔ سٹیٹس حاصل ہو گیا تو یہ آرزو پیدا ہوئی کہ لوگ سر اٹھا اٹھا کر دیکھیں۔ اب لوگ سر اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے۔

لوگ تو دیکھتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ گھر والے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ باغ تو دیکھتے تھے لیکن باغ کے مالی کو نہیں دیکھتے تھے گھر میں کسی کو احساس نہ تھا کہ کس مالی نے بہا بہا کر وہ گل بوٹے اگائے تھے۔

بچے سمجھتے تھے کہ باغ اچھا ہے۔ خاصہ ہے۔ او کے ہے اسے ہونا ہی چاہئے تھا۔ اس لئے ہے۔

بیگم. جس نے آدھی زندگی میاں کی مسلسل مشقت کی اڑتی ہوئی دھول میں کاٹی تھی. وہ بھی ماضی کو بھول چکی تھی۔ مشقت کو. دھول کو. مزدور معمار کو وہ سمجھنے لگی تھی جیسے وہ ہمیشہ سے ایسے ہی رہتی رہی ہو جیسے کہ اب رہ رہی تھی۔ جیسے ایسے رہنا اس کا پیدائشی حق ہو

ماضی صرف سید اکبر کو یاد آتا تھا۔ کبھی کبھی۔ مگر آتا تھا۔

شاید اس لئے کہ یاد اس میں تفاخر پیدا کرتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ گھر والوں کو بھی اس تخلیق کار کا احساس ہو۔ لیکن وہ بوٹے جو چلی نہر کے کنارے اگے ہوتے ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ پانی کیا ہوتا ہے

کبھی کبھی اسے گھر والوں کی بے حسی پر غصہ آتا تھا۔ کبھی کبھار۔ آتا اور چلا جاتا لیکن ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ وہ سب کچھ۔ اتنا کچھ دفعتاً یوں نظر آئے جسے کچھ بھی نہ ہو۔

چند ایک روز تو وہ اس اداس کن خیال کو دباتا رہا ـــ دب تو جاتا تھا۔ لیکن۔ اتنے ہی زور سے پھر ابھرتا تھا۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے کہ جب اتنا کچھ۔ کچھ بھی نہیں معلوم دینے لگے تو وہ

واقعی میں کچھ بھی نہیں ہو کر رہ جاتا ہے اور جب ارد گرد کچھ بھی نہیں کا صحرا پھیل جائے تو دل صحرانوردی پر مچل جاتا ہے۔

اس کچھ بھی نہیں کو دیکھ دیکھ کر سید اکبر کا دل اچاٹ ہو گیا اور ایک روز وہ چپ چاپ کسی کو بتائے بغیر اپنا ٹریولنگ بیگ اٹھا کر گھر سے باہر نکل گیا پھر جو اسے ہوش آیا تو وہ سانگھڑ میں تھا۔

سانگھڑ ایک بے آب و گیاہ صحرا تھا جہاں سارا دن تیز ہوا چلتی تھی۔ بظاہر جس کا مقصد چاروں طرف پھیلی ہوئی ریت اڑانا اور ٹیلوں کو از سر نو ترتیب دینا تھا۔ اس صحرا میں کہیں کہیں جھگی نما بستیاں تھیں۔ چار چھ سال میں ایک بار بارش ہوتی تھی۔ پانی چھپڑوں میں محفوظ کر لیا جاتا۔ چھپڑ سوکھ جاتا تو بستی کے لوگ مراجعت کر جاتے

چند ایک سال پہلے سید اکبر کو پتہ چلا تھا کہ سرکار سانگھڑ میں نہر چلانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ سروے ہو چکا ہے کسی کو بتائے بغیر اس نے سانگھڑ میں دس مربع زمین کوڑیوں کے بھاؤ خرید لی تھی۔ اس امید پر کہ نہر چل پڑی تو لاکھوں کی املاک بن جائے گی۔ مٹھی کھوئی بستی کے قریب چار ایک کوٹھڑیاں بنوالی تھیں۔ اور ان میں مختصر سا رہائشی سامان رکھوا دیا تھا کہ بوقت ضرورت کام آئے۔

مٹھی کھوئی پہنچ کر پہلے دو دن تو سید اکبر ارد گرد پھیلے ہوئے منظر کو دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے موجیں مارتا ہوا ریت کا پھیلاؤ تھا۔ اس کچھ بھی نہیں اور اس کچھ بھی نہیں میں کتنا فرق تھا۔ وہ سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کچھ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہاں تنگی تھی مخملی تنگی، ریشمی تنگی، افراط زدہ تنگی۔ یہاں وسعت تھی۔ بے پناہ وسعت، وسیع پھیلاؤ کے اوپر پھیکا آسمان تمبو کی طرح تنا ہوا تھا۔ وہاں اس نے کبھی آسمان نہ دیکھا تھا۔ یہاں ریت کے پھیلاؤ کی ویرانی اور اداسی سے گھبرا کر نگاہ آسمان کی طرف اٹھ جاتی۔

یوں محسوس ہوتا کہ وہاں کوئی ہو۔ خواہ مخواہ اک امید بندھ جاتی کہ کوئی ہے۔ پھر ایک زیر لبی سنائی دیتی۔ ”میں ہوں۔ ہاں۔ میں ہوں“

سیاح کہتے ہیں کہ اگر میں کے بوجھ سے آزاد ہونا چاہتے ہو۔ اگر ذہنی کشمکش کی کھینچا تانی سے بچنا چاہتے ہو تو کسی پھیلاؤ میں جا رہو چاہے وہ پانی کا پھیلاؤ ہو، ریت کا ہو یا

آسمان کا پھیلاؤ سے رشتہ استوار رکھو گے تو دل تنگ نہ ہو گا۔ آسمان سے تعلق قائم کرو گے تو ایک امید سی بندھی رہے گی۔

دو دن میں ہی سانکھڑ کے دوسرے پھیلاؤ نے اس کے ذہن سے پانی بھر بھر مشکیں پانے والے مالی کو نکال دیا۔ اس کے ساتھ ہی سب شکوے شکایت نکل گئے۔ میں کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اندر کا محنت کش جاگا۔ یہاں کچھ کرنا چاہیئے۔ شاید ہینڈ پمپ لگ سکے کنواں کھد سکے۔ ٹیوب ویل لگ سکے۔ اپنے لئے نہیں، سانکھڑ کے لئے ویرانہ خود کے لئے سوچنے نہیں دیتا۔

سید اکبر کی آمد پر بستی میں شور مچ گیا کہ زمیندار آیا ہوا ہے۔ بستی کے لوگ سلام کرنے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے تحفے تھے۔ کوئی اچار کا بھانڈا لایا، کوئی سوکھی سبزی کی پوٹلی، کوئی گڑ کی بھیلی۔ وہ سب غربت کے مارے ہوئے تھے لیکن ان کے چہروں پر عجیب سا سکون تھا، تشکر تھا، انداز میں بے چینی نہ تھی۔

ان کے ساتھ مائی عنداں بھی آئی۔ بولی۔ "مینڈا سید سائیں۔ میں بھلا کیا دوں گی تجھے میں تو لینے آئی ہوئی۔ کوئی گولی دے مجھے کہ سر پیڑ سے جان چھوٹے۔ سورج چڑھتا ہے تو ٹیس پڑنی شروع ہوتی ہے۔ غروب ہونے تک چلتی ہے۔

اگلے روز مائی عنداں نے ساری بستی میں شور مچا دیا کہ شاہ صاحب کی گولی نے تو جادو کر دیا۔ پیڑ کا نام نشان نہیں رہا۔

اگلے روز بستی کی پانچ عورتیں پیڑ گولی لینے کے لئے آ گئیں۔ ایک کمر درد سے لاچار تھی دوسری کا گھٹنا دکھتا تھا تیسری کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ چوتھی پیٹ تلے کی درد کی ماری ہوئی تھی۔ یونہی مریضوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔

سید اکبر کو احساس ہوا کہ اگر اسی طرح مریضوں کا تانتا بندھا رہا تو بکسا بھر کر گولیاں لانی پڑیں گی۔ اس لئے وہ جیپ لے کر شہر کی طرف بھاگا۔ شہر میں وہ پہلے ٹیوب ویل والوں سے ملا پھر ایک جنریٹر خریدا۔ جب وہ کیمسٹ ہول سیلر کے پاس دوائیاں خرید رہا تھا تو ماسٹر محمد اکرم مل گئے جو کسی زمانے میں اسے پڑھایا کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب اسے گھر لے گئے۔ دوائیوں کی چِٹی دیکھ کر بولے۔ اتنی ساری گولیاں؟ سید اکبر نے انہیں گاؤں کی بات سنائی۔ وہ بولے۔ بے شک یہ گولیاں بہت اچھی ہیں۔ چونکہ درد سے نجات دلاتی ہے لیکن

سید اکبر یہ طریقہ علاج تو اتفاقیہ سسٹم ہے گولی کھاؤ اور اچھے ہو جاؤ پھر گولی کھاؤ اور پھر اچھے ہو جاؤ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ مریض کو شفا ہو جائے تو یہ گولیاں کام نہ دیں گی۔

ماسٹر صاحب نے ایک پیٹی ہومیوپیتھک دواؤں کی بند ھوا دی ساتھ دو کتابیں خرید دیں۔ بولے اس کتاب کو کھولنا ہر بیماری کے سامنے دوا کا نام لکھا تھا۔ اللہ کا نام لے کر وہ دوا دے دینا۔

سید اکبر ایک عقلی آدمی تھا۔ وہ کاز اور ایفکٹ کو مانتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ محنت کے بوٹے پر کامیابی کا پھل لگتا ہے۔ دوا کی پگ ڈنڈی پر شفا کی منزل واقع ہے۔ گاؤں پہنچ کر اس نے کئی ایک دن ہومیو دوائیوں کی پیٹی کو نہ کھولا اور گولیاں ہی بانٹتا رہا۔

سید اکبر کی ماڑی میں دور دور سے مریض آنے لگے۔ مریضوں کو گولیاں دیتے ہوئے اسے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ یہ خوشی اک نئی خوشی تھی۔ دینے کی خوشی۔ شہر میں بھی اس سے لیتے تھے۔ وہ دیتا نہیں تھا۔ لے کر وہ یوں اس کی طرف دیکھتے تھے جیسے لینا ان کا حق تھا اس کا احسان نہ تھا۔ یہاں وہ لوگوں کو دیتا تھا۔ اور لینے والے احساس شکر سے بھیگی ہوئی نگاہ سے اسے دیکھتے تھے۔ اس نگاہ میں پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ شکر گزاری. احترام. عقیدت اور دعائیں۔ وہ نگاہ اسے ایسے لگتی جیسے نگاہ نہیں بلکہ سجدہ ہو۔

سیانے کہتے ہیں. دنیا ایک مشکل عمل ہے۔ جب آپ دینے لگتے ہیں تو اندر سے اک بریک لگ جاتی ہے۔ اور ہاتھ آگے نہیں بڑھتا. رک جاتا ہے۔ کیا یہ حاجت مند ہے۔ حق دار ہے۔ یہ حق دار نہیں۔ یہ تو منگتا ہے۔ مشٹنڈا ہے کام کیوں نہیں کرتا۔

دینے کے عمل میں ایک ساونڈ بیریئر سی رکاوٹ آ جاتی ہے۔ اگر یہ ساونڈ بیریئر ٹوٹ جائے تو پھر دینے کے عمل میں ایک لذت ایک نشہ ابھرتا ہے اور دینے والا گھر اجاڑ تماشہ دیکھنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

سید اکبر کا بیریئر ٹوٹ چکا تھا۔ پہلے وہ میٹھی کھوئی میں گولیاں بانٹتا رہا۔ پھر دور دور کی بستیوں میں جانے لگا اور نگاہوں کے سجدے اسے گھیرے میں لیتے گئے۔

پھر ایک معجزہ رونما ہوا۔ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ یہ کیا ہوا۔ کون تھا یہ۔

ہوا یہ کہ دور کی ایک بستی میں ایک ادھیڑ بیوہ نوراں کا نوجوان بیٹا شیدا دو سال سے

اپاہج تھا۔ دونوں ٹانگیں جڑی ہوئی تھیں۔ سیاد اکبرماں بیٹے کو جیپ میں ڈال کر سید ماڑی لے آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سی گولی دے۔ وہ بے چین تھا۔ پھر اسے یاد آیا۔ اس نے ہومیوپیتھک ادویات کی پٹی کھولی رات بھر وہ کتاب پڑھتا رہا۔ اگلے دن اس نے کتاب میں لکھی ہوئی دوا تلاش کی۔ شیشی ہاتھ میں اٹھائے باہر نکلا۔

بھور سمے نے ریت کے اس پھیلاؤ کو ایک عجیب نورانیت بخش رکھی تھی۔ اس نے انجانے میں آسمان کی طرف دیکھا۔ اس محسوس ہوا جیسے بھور سمے میں آسمان اور زمین ایک ہو چکے ہوں۔ اور چاروں طرف ایک اثبات بھری مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہو۔ اس نے نوراں کے بیٹے شیدے کے منہ میں دوا کا ایک قطرہ ڈال دیا۔ تین دنوں میں شیدے کی ٹانگیں کھل گئیں۔ شیدے کو خود یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی ٹانگیں کھل گئی ہیں۔ نوراں کبھی بیٹے کی ٹانگوں کی طرف دیکھتی کبھی سید اکبر کی طرف۔

بستی میں شور مچ گیا کہ شیدا چل پھر رہا ہے۔ چار ایک دن کے بعد شیدے نے ماں سے کہا ماں میں شہر جاؤں گا۔ کمائی کروں گا۔ ڈھیروں پیسہ تجھے بھیجوں گا۔ اب تو کسی کی محتاج نہیں رہے گی"۔

شیدے کے جانے کے بعد بھی نوراں سید اکبر کے ڈیرے پر رہی۔ وہ صاحب اس کا ناشتہ بناتی۔ جیپ میں اس کے ساتھ بستی بستی جاتی۔ لوگوں کو گولیاں بانٹتی۔ دوپہر کو اس کا کھانا پکاتی کپڑے دھوتی اور پھر دروازے سے لگ کر کھڑی رہتی کہ کب شاہ جی کو ضرورت پڑے اور وہ اس کی خدمت میں لگ جائے۔

ایک روز سید اکبر نے پوچھا۔ "نوراں تو اپنے گھر کیوں نہیں جاتی"؟ وہ بولی۔ "سائیں مینڈا! اب یہی میرا گھر ہے جس نے میرے بیٹے کو جیون دیا ہے۔ اس کی خدمت میں میں سارا جیون بتا دوں تو بھی کم ہے۔

اس کے بعد جب ہی سید اکبر دیکھتا نوراں یا تو دروازے سے لگی ہوتی یا اس کے پلنگ کی پائنسی پر سر رکھے اس انتظار میں بیٹھی ہوتی کہ کب وہ اشارہ کرے اور وہ اسے پانی پلائے چائے بنا کر دے۔ سید اکبر حیرت سے نوراں کی طرف دیکھتا۔ اسے ایسے لگتا جیسے نوراں بھی عقیدت کا ایک سمٹا ہوا پھیلاؤ ہو۔

گھر کے خیال نے سید اکبر کو ایک ریشمی مخملی تنگی میں قید کر دیا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آیا۔ باہر سرمئی ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔

سید اکبر سوچ رہا تھا کہ گم شدہ اشتہار کا جواب دے یا نہ دے۔ اسے صرف ایک فکر دامن گیر تھی۔ اس کے ذاتی اکاونٹ میں صرف تیس ہزار کی رقم باقی تھی۔ کیا وہ زندگی بھر اس حقیر رقم سے علاقے کے لوگوں میں دوائیاں بانٹ سکے گا۔

اس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ ستارے اس کی طرف اشارے کر کے ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر ہنس رہے تھے۔ صرف تیس ہزار. صرف تیس ہزار۔ پھر آسمان کی اوٹ سے ایک گھمبھیر سرگوشی ابھری۔ ہم جو ہیں۔ سارا پھیلاؤ ادب سے سمٹ کر ساکت ہو گیا۔

اس نے اچانک کمرے کی طرف دیکھا۔ نوراں سمٹ کر دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ جیسے اک ہنگامہ ساکت ہو گیا ہو۔

"تو یہاں کھڑی ہے"۔ وہ بولا۔ آ۔ اندر آ جا۔ اس نے نوراں کی بانہہ پکڑ لی۔ اسے اندر لے گیا۔ "بیٹھ جا" اس نے پلنگ پر بیٹھے ہوئے کہا۔۔ "نہیں نیچے نہیں یہاں پلنگ پر۔ نہیں سائیں مینڈا تساڈے برابر بیٹھوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔ نوراں بولی"۔

"میری طرف دیکھ"۔ وہ بولا۔ تو میرے ساتھ نکاح پڑھائے گی کیا"؟ ایک ساعت کے لئے عقیدت کے پھیلاؤ کی دھول میں دبی ہوئی عورت نے سر نکالا۔ گالوں پر سرخی دوڑی۔ آنکھوں سے سپنے کی ایک لاٹ نکلی چمکی اور پھر سے اسی دھول میں دب گئی۔ بجھ گئی۔

"نہ مینڈا سائیں"۔ مدھم آواز آئی۔ "میں تیرے لائق نہیں ہوں"۔

سید اکبر نے اخبار اٹھایا اور ان جانے میں اسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

رئیسہ حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ "یہ کیا کر رہا ہے تو"۔ نوراں پلنگ کی پائنتی پر سر ٹیکے یوں پڑی تھی جیسے سجدے میں ہو۔

ممتا کا بھید

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اس جگ میں کئی واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو سالہا سال کے بعد پھر دہرائے جاتے ہیں۔

مثلاً پچھلے بسنت کے مہینے میں پور نماشی کی رات کو جگماں گاؤں کے لوگ چھتوں پر چڑھ کر حیرت سے بڑی پہاڑی کی چوٹی کے ویرانے پر واقع جگ ماں کے صدیوں پرانے ٹوٹے پھوٹے مندر کی گھنٹیوں کی آواز سن رہے تھے۔

اور گاؤں کا سو سالہ بوڑھا وردھمے چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا تھا۔ لوگو۔ آج سے ساٹھ برس بسنت کی پور نماشی کی رات کو جگ ماں مندر سے گھنٹیوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ پھر وہ آوازیں بند ہو گئیں اور اب ساٹھ سال کے بعد پھر سے گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ بھگوان خیر کرے۔ پتہ نہیں کیا بھید ہے۔

جہاں آج جگ ماں گاؤں آباد ہے وہاں سالہا سال پہلے ایک شہر آباد تھا جو راجہ شماں پرادھے کی راجدھانی تھی۔ راجہ کو عورتوں سے گھرے رہنے کا بڑا چاؤ تھا۔ اس لئے اس کے ارد گرد بنی سجی بانکی چنچل عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ راجہ کی پہلی رانی بڑی حسین عورت تھی۔ لیکن جب سے اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا. اس نے راجہ کی محفل میں حاضری دینا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر راجہ کو بہت غصہ آیا تھا۔

ایک روز راجہ مہارانی پرن متوا کے پاس آیا۔ غصے میں بولا۔ "مہارانی! دوجی رانیاں سب ہمارے گرد پھیرے لیتی رہتی ہیں۔ اس بات کی خواہش مند رہتی ہیں کہ ہماری توجہ حاصل کریں۔ لیکن تو, ہماری محفل میں حاضری نہیں دیتی ۔ کیا تجھے ہماری پرواہ نہیں؟" رہی۔

مہارانی بولی۔ "مہاراج! وہ جو آپ کے گرد پھیرے لیتی ہیں انہیں آپ کا لوبھ ہے۔ وہ ناریاں ہیں مہاراج! وہ اپنی آگ میں جل رہی ہیں۔ میں ناری نہیں ہوں۔ ماں ہوں۔ میں نے آپ کو جنم دیا ہے۔ بالک کے روپ میں آپ ہر دم میرے پاس رہتے ہیں۔

اب میں آپکی سیوا میں حاضری دینے کی محتاج نہیں رہی۔ اب جو آپ مجھ سے ملنا چاہیں تو آپ کو خود میرے پاس آنا ہوگا۔"

یہ سن کر راجہ غصے سے بھوت بن گیا۔ اس نے یہی پہاڑی کی چوٹی پر ایک جھونپڑی بنوائی اور مہارانی کو دیس نکالا دے کر ایک باندی کے ساتھ اس جھونپڑی میں بھجوا دیا۔

مہارانی نے اپنی جوانی اس جھونپڑی میں اکیلے میں گزاری۔ لوگوں کے دلوں میں مہارانی کی بڑی عزت پیدا ہوگئی۔ اور وہ اسے جگت ماں کے نام سے پکارنے لگے۔

راجہ جب بوڑھا ہوگیا اور عورتوں نے اس کے ارد گرد پھیرے لینے چھوڑ دیئے تو دہ۔ اسے مہارانی پرن متوا یاد آئی اور وہ اپنے رویئے پر بڑا نادم ہوا۔

ایک روز وہ اکیلا پہاڑی پر چڑھ کر مہارانی کی خدمت میں جا پہنچا۔ کہنے لگا "اے جگت ماتا! میں آگیا"۔

اس کے بعد راجہ عمر بھر جگت ماتا کے ساتھ جھونپڑی میں رہا۔ اس نے اپنے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا اور خود گیان دھیان میں عمر گزار دی۔

جب جگت ماتا فوت ہوئی تو راجہ نے اس کی یاد میں وہاں ایک مندر بنوایا۔ جو جگت ماں کے نام سے مشہور ہوا۔

ساری شرارت اس حادثے کی تھی جو نوشہر پر رونما ہوا تھا۔

اگر نوشہر پر حادثہ رونما نہ ہوتا تو نومان حرکت کے فریب میں نہ آتا۔

اگر نومان حرکت کے فریب میں نہ آتا تو امنا میں ممتا کا مان نہ جاگتا۔

اور اگر امنا میں ممتا کا مان نہ جاگتا تو جگ ماں کے مندر میں اس پور تماشی کی رات گھنٹیاں نہ بجتیں اور ممتا کا بھید نہ کھلتا۔

وہ حادثہ عام حادثہ نہ تھا بلکہ گپت حادثہ تھا۔

نوشہر میں کسی کو احساس نہ ہوا کہ ہم حادثہ سے گزر رہے ہیں کہ حادثہ ہم پر وقوع پذیر ہوا ہے۔ اور ہمیں کیا سے کیا بنا گیا ہے۔ عین اس طرح جس طرح برسات میں چیونٹیوں کو پر لگ جاتے ہیں۔ وہ اڑنے لگتی ہیں لیکن انہیں احساس نہیں ہوتا کہ وہ اڑ رہی

ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ہم حسب معمول رینگ رہی ہیں۔

پتہ نہیں اس حادثے کا محرک کون تھا بہر حال اب کا مرکز نوشہر کا گھنٹہ گھر تھا جو شہر کے عین درمیان میں ایستادہ تھا۔ گھنٹہ گھر کا گھڑیال اتنا خوش آواز اور سریلا تھا کہ شہر کے ہر گھر میں اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ نوشہر کے رہنے والے ہر صبح اپنی گھڑیاں گھڑیال سے ملا لیا کرتے تھے۔

ایک روز جب وہ بیدار ہوئے۔ گھڑیال بجا تو وہ حیران رہ گئے۔ ان کی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے تھیں۔ پھر کئی ایک دن مسلسل یونہی ہوتا رہا۔ روز گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے ہوتیں۔ مجبوراً انہوں نے گھڑیوں کی رفتار تیز کر دی۔ تاکہ روز روز گھڑیاں ملانے کی کوفت سے نجات ملے۔

گھڑیاں ٹک ٹکا ٹک بجنے لگیں تو ان کا اثر سارے ماحول پر ہوا۔ نبضیں تیز ہو گئیں۔ دوران خون میں شدت پیدا ہو گئی۔ دل کچھ زیادہ ہی دھڑکنے لگے۔ جذبات میں بلبلے اٹھنے لگے۔ خیالات میں گھمن گھیریاں پیدا ہو گئیں۔ آوازیں شور شرابے میں بدل گئیں۔ محبتیں ہشر میں بدل گئیں۔ خواہشوں میں مستی پیدا ہو گئی۔ خوش بوئیں تیز بوئیں بر گئیں سریں پنچم ہو گئیں لے لیست سے درست ہو گئی۔ تمبو چڑھ گئے۔ گیت دل کی بجا۔ جسم کو جھلانے لگے۔ قیام معدوم ہو گئے۔ حرکت چل نکلی۔ ایمان کے ٹھہرے پانیوں میر شکوک کے چھینٹے اڑنے لگے۔

چونکہ یہ تبدیلی انفرادی نہ تھی۔ شہر کے سب لوگ اسی منڈول میں بیٹھے تھے۔ اس لئے کسی کو احساس نہ ہوا کہ کچھ ہوا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ کہ شہر جو دلکی چال چل ر تھا۔ سرپٹ دوڑنے لگا ہے۔

نوشہر کے اس حادثے کو شہر کے ارد گرد واقع گاؤں والوں نے محسوس کیا۔ اگرچہ وہ شہر سے دور تھے لیکن شہر کی آوازیں ان تک پہنچتی تھیں۔ انہوں نے سنا کہ شہر جو پہلے ٹک ٹک اچلا کرتا تھا اب ٹک ٹکا ٹک چلنے لگا ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہوئے۔ انہیں بات سمجھ میں نہ آئی کہ شہر کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ سمجھے کہ کچھ ہو گیا ہے کچھ ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ ایسا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ گاؤں والوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں شہر پر مرکوز ہو گئیں۔

گاؤں کے نوجوان ان انوکھی باتوں کو شوق سے دیکھنے لگے۔ ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شہر میں کچھ ہو رہا ہے. کچھ ہونے والا ہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے خوف زدہ ہو گئے۔ اللہ خیر کرے شہر میں کچھ ہونے والا ہے۔

بی پہاڑی کے نیچے عوان حویلی میں بیگماں کی آنکھیں شہر پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ دن میں کئی ایک بار حویلی کی چھت پر چڑھ کر گھنٹوں شہر کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔

بیگماں کے دل میں امنا کے متعلق بے نام اندیشے اٹھ رہے تھے۔ امنا اس کی بیٹی تھی جو نو شہر میں بیاہی ہوئی تھی اور ان دنوں پہلی جنائی کے لئے گاؤں آئی ہوئی تھی۔

چند ایک روز تو بیگماں شہر کی طرف تشویش بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنے بڑے بیٹے حسن کو بلایا۔ کہنے لگی "پتر یہ شہر کو کیا ہو رہا؟ ہے مجھے شہر کے تیور اچھے نہیں دکھتے"۔

حسن بولا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شہر میں کچھ نا کچھ ہوتا ہی رہتا ہے اماں"۔

"نہ بیٹا" وہ بولی۔ "یہ ہونا وہ ہونا نہیں۔ یہ ہوتے رہنے والا ہوتا نہیں۔ تو امنا کو سسرال لے جا تاکہ امنا پر بھی وہ کچھ ہو جائے جو نومان پر ہو رہا ہے۔ لڑکی پیچھے نہ رہ جائے۔ اگر امنا پیچھے رہ گئی تو گھر والے سے اس کا میل نہ ہو سکے گا۔ اور جو یہ اس کے ساتھ پاؤں ملا کر نہ چل سکی تو بچھڑ جائے گی"۔

"اچھا ماں اگر تو چاہتی ہے تو میں اسے شہر چھوڑ آتا ہوں۔ تو امنا کو تیار کر دے"۔ حسن نے کہا۔

امنا گاؤں کی مٹیار تھی۔ وہ سراپا حسن تھی لیکن اسکا حسن شہر والیوں سے ہٹ کر تھا۔ وہ حسن جو قیام میں پیدا ہوتا ہے۔ ہر حرکت کے دوران وہ کئی ایک قیام پیدا کرتی تھی۔ کئی ایک تصویریں بن جاتیں خوبصورت پوز۔ دلکش فریم۔

امنا میں لڑکی کم کم تھی، مٹیار زیادہ۔ شوخی کم کم تھی وقار زیادہ۔ بے چینی کم کم تھی خمار زیادہ۔ کالج کی لڑکیوں میں وہ الگ تھلگ نظر آتی تھی۔ جیسے چلتے فلم میں ایک سٹل آ جائے۔

ایک دن جب وہ کالج کے گیٹ پر کھڑی اپنی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ تو نومان

نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے گاڑی روک لی اور دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

پھر وہ روز اسے دیکھنے کے لئے کالج کے گیٹ پر رک کر انتظار کرنے لگا۔

نومان شہر کے متمول آدمیوں میں سے تھا۔ وہ کارخانے دار تھا۔ باپ فوت ہو چکا تھا۔ گھر میں صرف ماں ہی ماں تھی۔

ماں دیر سے خواہشمند تھی کہ لڑکا گھر بسا لے۔ لیکن نومان کا کاروبار کی طرف اس حد تک متوجہ تھا کہ شادی کرنے پر رضامند نہ ہوتا تھا۔

بیٹے نے جب ماں سے امنا کی بات کی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ اتا پتا لگانے کے لئے خود بیگماں گاؤں گئی۔ جب اسے پتہ چلا کہ امنا کا بھائی گاؤں کا چوہدری ہے۔ خاندان اچھا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے تو اس نے پیغام دیدیا اور دو مہینے کے اندر اندر نومان امنا کی شادی ہو گئی ایک سال بعد امنا امید سے ہو گئی اور پہلی جنائی کے لئے میکے آ گئی۔

بیٹے نے ہامی بھر لی تو بیگماں مطمئن ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ رات کو امنا سے بات کرے گی اور اسے شہر جانے پر آمادہ کر لے گی۔

شام کے وقت دروازہ بجا۔ بیگماں نے کواڑ کھولا تو سامنے نومان کا نوکر احمد میاں کھڑا تھا۔ احمد میاں نے کہا۔ "مجھے بڑی بیگم نے بھیجا ہے۔ میں بہو بیگم کو لینے آیا ہوں۔ بڑی بیگم نے کہا ہے امنا بی بی جیسی بھی ہوں. جس حالت میں بھی ہوں فوراً گھر آ جائیں۔ اگر آنے میں دیر کی تو پتہ نہیں یہاں کیا ہو جائے گا۔

بیگماں نے احمد میاں سے پوچھا کہ بات کیا ہے

احمد میاں بولا۔ "بی بی جی شہر تو حرکت کے پھیر میں آ گیا ہے۔ وہاں بگولے چلنے لگے ہیں۔ گھمنگھیریوں کی زد میں آ گیا ہے۔ صاحب کے گرد کئی ایک ترت پھرت لڑکیاں گھومنے لگی ہیں۔ روز کے روز پارٹیاں ہوتی ہیں۔ کیسٹ بجتے ہیں۔ ڈسکو ہوتا ہے۔ بڑی بیگم سخت گھبرائی ہوئی ہیں"۔

احمد میاں سے متعلق انتظامات سے فارغ ہو کر بیگماں امنا کے کمرے میں داخل ہوئی۔

امنا یوں مطمئن بیٹھی تھی جیسے رس سے بھرا آم ہو۔ اس کے اطمینان میں مستی کی جھلک تھی۔ ایسی مستی جو چھلکتی نہیں۔ ایسی مستی جو صرف ممتا پیدا کر سکتی ہے۔

بیگماں بولی۔ "بیٹی! احمد میاں تجھے لینے آیا ہے۔

احمد میاں ــــ امنا بولی۔ اماں اگر وہ خود آتے تو میں چلی جاتی۔ میں احمد میاں کے ساتھ نہیں جاؤں گی"۔

"احمد میاں کو بڑی بیگم نے بھیجا ہے"۔ ماں نے کہا۔ "وہ کہتی ہیں شہر میں بگولے چل رہے ہیں گھمن گھیریاں گھوم رہی ہیں"۔

"نہیں اماں"۔ امنا نے کہا۔ "میں گھمن گھیریاں جوگی نہیں ہوں۔ میں تو تنکا تنکا ہو کر بکھر جاؤں گی"۔

"نہیں بیٹے تیری ساس نے تجھے بلایا ہے کہ جو نومان پر ہو رہا ہے تجھ پر بھی ہو جائے۔ نہیں تو تو پیچھے رہ جائے گی۔ نومان سے تیرا ساتھ چھوٹ جائے گا"۔

"نہیں ماں"۔ وہ بولی۔ میرا ساتھ ان سے کیسے چھوٹ سکتا ہے۔ وہ تو میرے اندر ہیں ماں۔ میرے جسم کا بند بندان سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ انہوں نے میرے ہر دیئے میں ممتا کا دیپ جلا دیا ہے"۔

نہیں بٹی تو نہیں سمجھتی۔ بیوی کا کام ہے کہ وہ میاں کے ساتھ قدم ملا کر چلے"۔

تو کیا بیوی کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی"۔ امنا بولی۔

"نہیں بٹی"۔ بیگماں بولی۔ جو "لبھانے کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ انکی اپنی مرضی نہیں ہوتی۔ ہم عورتوں کا کام مردوں کو لبھانا ہے۔ اگر مرد لمبے بال پسند کرتے ہیں تو ہم بال بڑھا لیں گی۔ اگر چھوٹے بال پسند کرتے ہیں تو ہم بال کٹوا دیں گی۔ اگر انہیں بھرا بھرا جسم اچھا لگے گا تو ہم مٹیار بن جائیں گی اگر انہیں ترت پھرت اچھی لگے گی تو ہم ہڈیاں نکال لیں گی۔ پہلے وہ وفا کو پسند کرتے تھے تو عورتوں نے وفا اپنا لی تھی۔ اب وہ ہرجائی پسند کرتے ہیں تو عورتیں ہرجائی ہو گئی ہیں"۔

"نہیں ماں" امنا نے کہا۔ "وہ عورتیں نہیں۔ وہ تو ناریاں ہیں جن کا کام مردوں کو لبھانا ہے۔ ناری بن کر عورت نے اپنی قدر گنوا دی ہے۔ عورت تو ممتا کے لئے بنی ہے جس میں ممتا جاگ اٹھے وہ تو آپ محبت بانٹے گی۔ وہ محبت کی بھیک کیوں مانگے"۔

امنا کی بات سن کر بیگماں چلائی۔ "یا اللہ میں اس لڑکی کو کیسے سمجھاؤں یا اللہ!"۔

امنا مسکرا دی۔ بولی۔ "ماں جسے تو پکار رہی ہے وہ تو آپ ماں ہے جگت ماں"۔

"یہ ممتا اسی کی دین ہے۔ اس نے اپنے نور سے ممتا کی ایک کرن ماں کو دان کر دی ہے"۔ یہ سن کر دیر تک بیگماں یوں چپ چاپ کھڑی رہی جیسے اثر سے بھیگ گئی ہو۔

پھر جو اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو دروازے میں احمد میاں کھڑا تھا۔

احمد میاں آگے بڑھا۔ بولا۔ "بہو بیگم! آپ کو تو شہر جانا ضروری ہے۔ وہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ گھر وہ گھر نہیں رہا۔ صاحب وہ صاحب نہیں رہے"۔

امنا بولی۔ "احمد میاں! اگر وہ صاحب ہی نہیں ہے جن کا مجھ سے سمبندھ ہوا تھا تو میرا وہاں جانا کس کام کا"۔

ابھی امنا بات کر رہی تھی کہ ایک شور سنائی دیا۔ وہ گھبرا کر باہر نکلے. دیکھا کہ گاؤں کے سب لوگ چھتوں پر چڑھے ہوئے تھے اور حیرت سے بی پہاڑی کی چوٹی کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں جگماں مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور گاؤں کا بوڑھا وردھے سیس نوائے. ہاتھ جوڑے کھڑا وجدان بھری مستی میں گنگنا رہا تھا۔ دھن ہے جگ ماں۔ تو دھن ہے۔

سانپ

ہمارا سامان بندھا ہوا تھا۔ اور ہم دونوں ٹیکسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ آصفہ ٹوکری کے منہ پر رسی باندھ رہی تھی۔ میں اخبار کی سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ میں نے منہ سے اخبار ہٹائے بغیر پوچھا۔ "کیوں آصفہ تیاری مکمل ہو گئی نا"۔

"جی ہاں۔" اسکی مدہم آواز آئی۔

اس کے جی ہاں کے باوجود مجھے پتہ تھا کہ وہ شہر کو چھوڑ کر گاؤں جانا نہیں چاہتی۔ شہر کی رونق چھوڑ کر کس کا جی چاہتا ہے کہ گاؤں میں رہائش کرے۔ اگرچہ آصفہ کے لئے شہر کی رونق کبھی پیش منظر میں نہ آئی تھی چونکہ طبعاً وہ اکیلی تھی۔ پھر بھی پس منظر کی رونق تو تھی اور رونق چاہئے پیش منظر میں ہو یا پس منظر میں وہ بہر حال رونق ہوتی ہے۔

پھر ہمارا گاؤں بھی تو برائے نام گاؤں تھا۔ آپ جانتے ہیں پہاڑی علاقوں میں گاؤں نہیں ہوتے۔ گھر ہوتے ہیں۔ ویڑے ہوتے ہیں۔ دو یہاں میں. دو وہاں اس ٹیلے پر اور چار نیچے کھڈ میں۔ ان بکھرے ہوئے گھروں کو گاؤں نہیں کہا جا سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہمارا گاؤں بہت دور پاکستان کے ایک دور افتادہ کونے میں واقع ہے شہروں سے دور. سڑکوں سے دور. ہنگاموں سے دور جہاں امن ہی امن ہے اور لوگ امن سے اس قدر بیزار ہیں کہ رونق کے لئے انہوں نے برادری میں باہمی اختلافات کا سہارا لے رکھا ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانیوں کو سڑاھند سے بچانے کے لئے لہریں پیدا کرنی ہی پڑتی ہیں۔

لیکن نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد میں روز سوچا کرتا تھا کہ اب شہر میں رہنے کا مقصد کیا ہے۔ اس سوچ میں ڈب جھلکیاں کھاتے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے۔ کیا کروں۔ میں طبعاً سوچنے والا آدمی ہوں. کرنے والا نہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ سوچ میں ڈب جھلکیاں کھانے کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ ایسا کہ پھر فیصلہ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور خود فریبی کے تحت فیصلہ کر ھی لو تو عمل میں لانے کی توفیق نہیں ہوتی۔

پھر یہ ہوا کہ مالک مکان نے ہمیں نوٹس دے دیا کہ یا تو مکان خالی کر دو۔ نہیں تو اگلے مہینے

سے کرایہ دگنا ادا کرنا ہوگا۔ دگنا کرایہ دینے کی توفیق نہ تھی۔ سستا گھر تلاش کرنے کی ہمت نہ تھی۔ لہٰذا گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں ایک قابل رہائش مکان بھی تھا ساتھ تھوڑی سی زمین بھی تھی۔

"مجھے پتہ ہے۔" آصفہ میں نے کہا۔ "تو گاؤں جانا نہیں چاہتی۔" "چپ۔" اسکی آواز آئی۔

مجھے علم تھا کہ وہ میری بات کا جواب نہ دے گی۔ اس نے کبھی مجھے نہیں جی نہ کہا تھا۔ ایسے موقعہ پر وہ چپ ہو جایا کرتی تھی۔ چپ اس کا واحد انکار تھا۔ واحد ہتھیار تھا۔ اسکے منہ سے چپ سن کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ میں نے اخبار ہٹا کر اسکی جانب دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں چمک لہرا رہی تھی

"وہ۔" اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جیدا" وہ بولی۔ "وہ رو رہا ہے"

واقعی باہر سے جیدا کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ حسب معمول سسکیاں بھرتے ہوئے وہ چلا رہا تھا۔ "میں نہیں کروں گا میں نہیں کروں گا۔"

جیدا بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ ساتھ ہی بہت خود سر۔ ضدی۔ اسکی عمر تین سال کی ہوگی۔ ماں باپ ایک حادثے میں فوت ہو چکے تھے۔ ایک دور کے رشتے دار نے از راہ ہمدردی اسے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ یہ ہمدردی دکھاوے کی زیادہ تھی جذبے کی کم کم۔ ان کے اپنے تین بچے جو تھے۔ گھر والی جیدا کو کام پر لگانا چاہتی تھی لیکن جیدا اپنی مرضی کا مالک تھا۔ بڑا ہٹ دھرم تھا۔ صاف انکار کر دیتا۔ "نہیں کروں گا۔"

جیدا دن میں تین چار مرتبہ ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ سیدھا میرے پاس آتا۔ نہ سلام نہ دعا۔ نہ جان نہ پہچان آتے ہی حکم چلاتا۔ انکل آنٹی کو بولو مجھے سویٹ دے۔ آصفہ سے سویٹ لے کر وہ واپس چلا جاتا۔ آصفہ نے کئی بار کوشش کی تھی کہ اسے پاس بٹھائے۔ اس سے باتیں کرے۔ آصفہ اسے پکڑنے کی کوشش کرتی تو وہ چلا کر اسے ڈانٹتا۔ نہیں بلکہ آصفہ نے اس کے لئے کھلونے بھی منگوائے لیکن اسے کھلونوں سے کھیلنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

میں نے جیدا کی آواز سن کر کہا۔ "آصفہ! باہر کی کنڈی لگا دو کہیں جیدا اندر نہ آ جائے۔"

آصفہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن جوں کی توں بیٹھی رہی۔ دو ایک دن پہلے میں نے جیدا سے کہا تھا۔ "جیدا ہم جا رہے ہیں"۔ "کہاں۔" وہ چونکا۔

"اپنے گاؤں۔" آصفہ نے کہا۔

"نہیں" وہ بولا۔ "تم نہیں جاؤ گے۔"

"ہم تو جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں" اس نے چیخ کر کہا۔ پھر اسکی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ دھیمی آواز میں بولا۔ "تم چلے گئے تو میں سویٹ کس سے لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ سویٹ لئے بغیر باہر نکل گیا۔

وہ چلا گیا تو کمرے پر دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پرنم خاموشی۔

جیدا کے رونے کی آواز ختم ہوئی تو میں نے پھر سے بات چھیڑی۔ میں نے کہا آصفہ اگر گاؤں میں تیرا جی نہ لگا تو ہم قصبے میں جا کر رہائش کر لیں گے۔ وہاں ناڑا پل کافی بڑا قصبہ ہے وہاں سو گھر ہوں گے۔ گاؤں سے دس میل دور ہے۔ بڑی سڑک پر ہے۔ دریا پر پل ہے۔ غلے کی منڈی ہے۔ ٹرک آتے ہیں بسیں چلتی ہیں۔ بڑی چہل پہل رہتی ہے۔

"جی ہاں"۔ آصفہ بولی۔

جی ہاں جی ہاں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ صاحبو میرا المیہ یہ ہے کہ میں نے ایک جی ہاں سے شادی کر رکھی ہے۔ اس بد نصیبی کی تمام تر ذمہ داری خود مجھ پر پڑتی ہے۔ میں تین سال جانے ان جانے میں دعائیں مانگتا رہا تھا کہ یا اللہ میں اپنی بیوی کے منہ سے کبھی جی ہاں بھی سنوں۔ لوگو۔ کبھی بن سوچے سمجھے دعا نہ مانگنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ دعا منظور کر لے۔

آصفہ میری دوسری بیوی ہے۔ پہلی شہزادی تھی۔ وہ واقعی شہزادی تھی۔ اس نے کبھی کسی بات پر مجھ سے اتفاق نہ کیا تھا۔ میں اسے کہا کرتا تھا شہزادی کبھی تو میری بات مان لیا کر۔ لیکن میری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی تھی۔ پھر شہزادی ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔

آصفہ میرا چناؤ نہیں۔ یہ احسان مجھ پر خالہ نے کیا تھا۔ کہنے لگی۔ "سلیم. میں نے تیرے

لئے ایسی بیوی تلاش کی ہے جو تیرے گھر کو جنت بنا دے گی۔ " خالہ سچ کہتی تھی۔ آصفہ کے آنے کے بعد واقعی ہمارا گھر جنت تو بن گیا۔ لیکن گھر نہیں بنا۔ دوستو میں جنت میں رہتا ہوں۔ مجھے گھر نصیب نہیں ہوا۔ اور میں ان جانے میں چوری چوری دعائیں مانگتا ہوں کہ کوئی سانپ آ نکلے۔

مانا کہ نیک خاتون کی سبھی عزت کرتے ہیں۔ میں بھی کرتا ہوں لیکن نیک بیوی ____ اب میں نے جانا ہے کہ نیک بیوی ایسی ریوڑی کے مصداق ہوتی ہے جس میں کڑاکا نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں میاں کڑاکے کا مسمی کیوں ہوتا ہے۔ خالی مٹھاس کیوں اچھی نہیں لگتی۔ آصفہ کی مٹھاس اگر شوگر کوٹنگ جیسی ہوتی تو بھی بات بن جاتی۔ لیکن اس کی نیکی تو شہد کی طرح گاڑھی تھی۔

اللہ نہ کرے آپ کو کسی نیک آدمی کے ساتھ زندگی گزارنی پڑے۔ سیانے کہتے ہیں خبردار نیکی کے تفاخر سے بچو۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ایسا ہوتا ہے۔ کہ نیک لوگ جانے یا ان جانے میں اپنی نیکی کو تمغہ بنا کر چھاتی پر ٹانک لیتے ہیں اور لقہ کبوتر بن جاتے ہیں۔ آصفہ لقہ کبوتری نہ بنی تھی۔ اس نے اپنی نیکی پر کبھی مان نہیں کیا تھا۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اتنے اجلے نہ بنو کہ دوسرے میلے میلے نظر آئیں۔ بے شک آصفہ کو میں کبھی میلا نظر نہ آیا تھا۔ لیکن اس کا کیا کروں کہ آصفہ کے اجلے پن کو محسوس کر کے میں خود __ خود کو میلا سمجھنے لگا تھا۔ آصفہ کے ساتھ رہ کر میں گنہگار بن گیا تھا __ خواہ مخواہ حالانکہ یقین جانئے میں گنہگار نہیں ہوں۔ اچھا نہ سہی لیکن میں برا بھی تو نہیں ہوں۔ گنہگار بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انسان کے خمیر میں ضمیر کا عنصر اس قدر حاوی ہے کہ اس سے جان چھڑانا بڑی مشقت کا کام ہے

گھر میں ہم دو جی رہتے ہیں آصفہ اور میں۔ میں ۶۰ کے لگ بھگ ہوں وہ ۵۰ کی ہو گی۔ لیکن شائد اپنی نیکی کی وجہ سے یوں لگتی ہے جیسے مجھ سے پانچ سال بڑی ہو۔

پھر یہ بھی ہے کہ جب عورت کے اندر کا نسائی شعلہ بجھ جائے تو وہ باسی گوشت کی گٹھڑی بن کر رہ جاتی ہے۔

جب وہ جوان تھی اس وقت بھی اسکے نسائی دیئے کی لو اس قدر مدہم تھی کہ اسکی چمک

کبھی مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس بات نے آصفہ کو بالکل ہی بجھا دیا تھا۔

کہتے ہیں بیویاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو میاں کے لئے جیتی ہیں۔ دوسری وہ جو اولاد کے لئے جیتی ہیں۔ آصفہ دونوں طرف سے محروم تھی۔ میاں کی نہ اسے طلب تھی نہ خواہش۔ جب بھی میں اس کی بانہہ پکڑتا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے گناہ کر رہا ہوں۔

اولاد ہمارے نصیب میں نہ تھی۔ بڑے جتن کر دیکھے۔

شادی کے بعد شروع شروع میں میں آصفہ سے لڑا کرتا تھا۔ محلے والے اپنے اپنے گھر بیٹھے ہماری لڑائی پر رننگ کمنٹری کیا کرتے تھے۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسی لڑائی ہے جس میں صرف ایک پارٹی بولے جا رہی ہے۔ دوسری پارٹی جیسے موجود ہی نہیں۔ انہوں نے ہماری لڑائی کو ایک ہاتھ کی تالی کا نام دے رکھا تھا۔ دراصل میں لڑتا نہیں تھا بلکہ آصفہ کو سمجھانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ بی بی کچھ کرو کچھ بولو لڑو جھگڑو۔ اس کھڑے پانی میں کوئی حرکت پیدا ہو۔

دوستو ہم مرد بھی کتنے احمق ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دلیل دے کر ہم بیوی کو سمجھا سکتے ہیں۔

اب میں جان گیا ہوں۔ اس لئے میں نے ایک ہاتھ کی تالی بجانا چھوڑ دیا ہے۔

آصفہ کے پاس بیٹھ کر وقت گزارنا بھی مشکل تھا۔ کوئی کب تک جی ہاں جی ہاں کی گردان سنے۔ آصفہ باتیں کرنے والی عورت نہ تھی۔ پڑوسیوں کی غیبت کرنا اسے گوارہ نہ تھا۔ محلے کے سکینڈل سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے شک پڑتا تھا کہ وہ نا عورت ہے۔

باہر سے پام پام کی آواز آئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ٹیکسی آ گئی۔ "آصفہ! میں نے کہا۔ وہ جواب دیئے بغیر بادل ناخواستہ اٹھی (عین اسوقت جیدا بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا)

بندھے سامان کی طرف دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ کبھی سامان کی طرف دیکھتا کبھی آصفہ کی طرف۔ اسقدر بوکھلا گیا کہ اسے سویٹ مانگنا بھی یاد نہ رہا۔

"جیدے!" میں نے کہا۔ "ہم جا رہے ہیں۔ گاؤں"

"میں بھی جاؤں گا" وہ چیخ کر بولا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" میں نے کہا۔

"آؤ میں تمہیں سویٹ دوں۔" آصفہ بولی۔
"جاؤں گا۔ ۔ ۔ جاؤں گا" وہ چلایا۔ اس نے سویٹ کی طرف توجہ نہ دی
"تیری آنٹی کیا کہے گی۔" آصفہ بولی۔
"کچھ نہیں کہے گی۔" وہ روُنکا ہو کر بولا۔
دفعتاً میرے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ "آصفہ!" میں چلایا اور دیوانہ وار میں نے آصفہ کی طرف دیکھا۔
پہلی مرتبہ آصفہ کی آنکھ میں چمک لہرائی۔ ایسی چمک جو صرف گنہگار کی آنکھ میں لہرا سکتی ہے۔
"آصفہ!" خوشی سے میری چیخ نکل گئی۔
آصفہ نے بڑھ کر جیدے کو کمبل میں لپیٹ لیا۔

سبز پتا

سیانے کہتے ہیں بڑے بڑے واقعات چھوٹی چھوٹی باتوں کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں۔ کتنی چھوٹی سی چیز تھی۔ سبز پتا۔ سبز پتے نے ایک رستے بستے خاندان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

سبز پتا ایک کتاب کا عنوان تھا جو علم النباتات کے ایک مشاہیر نے لکھی تھی۔ اتفاق سے یہ کتاب رفیق کے ہاتھ لگ گئی۔ جوں جوں وہ سبز پتے میں قدرت کے حیرت انگیز نظام کے بارے میں پڑھتا گیا توں توں اس کے دل میں شعور پیدا ہوتا گیا کہ بیج ایک جن ہے جسے قدرت نے بوتل میں بند کر رکھا ہے۔ گویا روئیدگی کی طاقت کو سربمہر کر دیا گیا ہے۔ جوں جوں وہ سب پتے کے اسرار و رموز سے واقف ہوتا گیا توں توں اس کے دل میں کونپلیں پھوٹتی گئیں۔ پھول کھلتے گئے۔ ایک ایسا سبزا زار ابھرتا گیا جہاں روئیدگی تھی. تازگی تھی. امن تھا. سکون تھا۔ ایسا سکون جو بھور سے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اللہ میاں اتنے قریب آ جاتے ہیں۔ اتنے قریب کہ سب کچھ انکے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

رفیق کے دل میں سبز پتے کا ایسا عشق جاگا کہ اسے شہر کی شورا شوری. افراتفری اور روپیہ کمانے کی اندھی دوڑ سے نفرت ہو گئی۔

اس پر دونوں بھائیوں کے راستے الگ الگ ہو گئے۔

بڑا بھائی اعظم علی شہر میں جا کر کارخانہ دار بن گیا۔ اس کا گھر مغربی رنگ میں رنگا گیا اور اس کی زندگی پر حصول زر کے جنوں کا تمبو تن گیا۔ اور چھوٹے بھائی رفیق علی نے اپنے آبائی گاؤں سے بہت دور ایک فارم قائم کر لیا۔

یہ فارم ایک انوکھا فارم تھا۔ ایک طرف مرغی خانہ تھا جس میں دو ہزار مرغیاں تھیں دوسری طرف ایک تالاب تھا جس میں تلا. یہ مچھلیاں افزائش نسل کے لئے ڈال دی گئی تھیں۔ اس کے قریب ہی شہد کی مکھیوں کے بارہ ڈبے تھے جہاں مکھیاں شہد بنا رہی تھیں۔

وسط میں رہائشی مکان تھا جس کے ارد گرد تمیں قسم کے گلاب لگے ہوئے تھے جو دنیا کے مختلف ممالک سے منگوائے گئے تھے۔ گھر سے ہٹ کر ایک طرف ایچی کا باغ تھا۔ دوسری جانب مالٹے. کنو. اور گریپ فروٹ تھے۔ ایک کونے میں گھاس پھونس کی چھت تلے پان کی بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ دوسرے کونے میں تمبو کے پڑھتے۔

رفیق علی کے سر پر یہ دھن سوار تھی کہ ایسے پودے اگائے جو پاکستان میں نہیں ہوتے اور ان کے پھل دساور سے در آمد کئے جاتے ہیں۔ انہیں اپنے فارم میں لگائے۔ مثلاً سپاری، کالی مرچ. الی۔ اس کے لئے ایک ہاٹ ہاؤس بنوانے کی اشد ضرورت تھی۔ اس کا یہ خواب بڑی دیر تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ بہر حال وہ فارم خود کفیل تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ دودھ کے لئے گائیاں. بھینس اور بکریاں تھیں۔ کھانے کے لئے پھل تھے. سبزیاں تھیں. مرغیاں تھیں. مچھلی تھی. شہد تھا۔ شروع شروع میں دو ایک سال تو رفیق فارم کو تشکیل دینے میں شدت سے مصروف رہا۔ پھر جب فدم کی شکل نکل آئی۔ تو وہ بیٹھ کر اپنی جنت کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے دل میں پودوں کی روئیدگی کی حس جاگی۔ سبز پتے پھول اور پھل اپنی خاموش زبان میں اس سے باتیں کرنے لگے۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مگر ایسا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو آسمان کے نیچے بیٹھ کر پودوں کی روئیدگی کو دیکھتے ہیں دیکھتے ہیں کہ ڈنٹھل سے کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ کونپلیں کھل کر پتیاں بنتی ہیں۔ پتیاں بڑھ کر پتے بن جاتی ہیں۔ بوٹے پھیل کر درخت بن جاتے ہیں۔ ان کے روبرو کائنات کا خالق آ کھڑا ہوتا ہے۔

پھر وہ فرط انبساط سے چاروں طرف دیکھتا ہے اپنی مخلوق کی محبت کے جذبے سے پگھل کر سارے کھیت میں گھل مل جاتا ہے۔ پتوں میں ہریاول بن جاتا ہے۔ پھولوں میں رنگ بن جاتا ہے۔ پھلوں میں شیرینی۔

خالق اور مخلوق یوں گھل مل جاتے ہیں کہ وحدت کا احساس ابھرتا ہے۔ پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے پر ایسے ہوتا ہے۔

لیکن شہر میں ایسا نہیں ہوتا۔ شہر میں خالق اور مخلوق کے درمیان رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ اس لئے شہر میں گردنیں تنی رہتی ہیں چھاتیاں اکڑی رہتی ہے۔ مونچھیں مروڑی

رہتی ہے۔ شاید اس لئے کہ شہر میں انسان خود کو خالق سمجھتا ہے۔

بہر حال رفیق اور اس کی بیوی آصفہ دونوں فارم میں سبز پتوں کی روئیدگی کو دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔

پھر شفیق کی پیدائش کے بعد تینوں تخلیق کے حیران کن عمل کو دیکھنے لگے یوں آہستہ آہستہ شفیق جوان ہو گیا اور سبز پتے کے سحر میں رنگا گیا۔ اس پر باپ نے اسے ایگریکلچر یونیورسٹی میں بھیج دیا جہاں سے وہ ڈگری حاصل کر کے واپس فارم میں آ گیا۔

تکمیل تعلیم سے واپس آیا تو شفیق ایک مقصد حیات ساتھ لے آیا۔ اس مقصد میں بے شک سبز پتے کی بہت اہمیت تھی لیکن وہ فارم جس میں وہ پل کر جوان ہوا تھا. جس کی رفیق کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی. غیر اہم ہو چکا تھا۔

چار ایک ہفتے فارم میں بسر کرنے کے بعد بیٹے نے باپ سے کہا ابا جان مجھے اب اجازت دیجئے کہ میں اپنا کام شروع کروں۔

باپ نے جواب میں کہا۔ بیٹے. تم اپنا کام نہیں فارم میں شروع کیوں نہیں کرتے۔

شفیق نے کہا۔ ابا جان. میرا کام یہاں نہیں ہو سکتا۔ یہ فارم تو ایک مرغزار ہے۔ میرا کام تو وہاں ہو گا جہاں میلوں سبز پتے کا نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارے علاقے میں لاکھوں ایکڑ زمین غیر آباد پڑی ہے۔ کتاؤ کا یہ علاقہ جو چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر مشتمل ہے بے آب و گیاہ ویران پڑا ہے۔ وہاں کی بھربھری مٹی مردہ ہو چکی ہے۔ اس میں زندگی نہیں رہی۔ قوت نمو نہیں رہی میں چاہتا ہوں کہ تحقیق کروں۔ کوئی ایسا سبز پتا تلاش کروں جو ہلکی بارش میں اپنی جڑیں زمین میں گاڑ دے اور پھر چاروں طرف پھیلتا جائے۔ پھیلتا جائے حتیٰ کہ کتاؤ کے تمام ٹیلے اور نشان اس کی روئیدگی سے بھر جائیں اور خشک سالی اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

اگر مجھے ایسا سبز پتہ مل جائے چاہے وہ بوٹا ہو. جھاڑی ہو یا زمین کے ساتھ ساتھ رینگنے والی بیل ہو۔ تو میلوں علاقہ ہرا بھرا ہو جائے۔ اس علاقے کی تقدیر بدل جائے۔

باپ نے بیٹے کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ بیٹے ہاں. تمہاری ماں اور میں تمہاری اس قابل قدر جستجو میں حائل نہیں ہوں گے۔ بلکہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی اس کام میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔ لیکن بیٹے. تمہاری ماں کی یہ خواہش ہے کہ وہ تمہاری شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔

شفیق ہنس کر بولا۔ "ابا جان یہ کام شادی کے بعد نہیں ہو سکتا۔"

"تمہاری ماں کی خواہش ہے بیٹے۔"

"ابا جان" اس نے جواب دیا۔ "مجھے شادی سے انکار نہیں لیکن مجھے ایسی جیون ساتھی کہاں سے ملے گی جو اس کام میں میرے ساتھ ویرانوں میں ضم ہونے کے لئے تیار ہو۔"

عین اس وقت ڈاکیہ تار ہاتھ میں پکڑے داخل ہوا۔ بولا۔ "چودھری جی آپ کا تار آیا ہے۔"

تار کا نام سن کر شفیق کی ماں آصفہ دوڑی دوڑی آ گئی۔ "اللہ خیر کرے کس کا تار ہے؟"

"بڑے بھائی آ رہے ہیں۔" رفیق نے تار پڑھتے ہوئے کہا۔

"یہاں آ رہے ہیں کیا؟" آصفہ حیرت سے چلائی۔ "فارم پر؟"

وہ تو یہاں کبھی نہیں آتے۔

"بہرحال وہ آ رہے ہیں ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا جائے۔ انہیں کھانے میں کوئی ایسی چیز پیش نہ کی جائے جس سے شہر کی خوشبو آتی ہو۔ خالص دیہاتی چیزیں کھلائی جائیں۔ رس کی کھیر. کڑھی۔ گھٹا ہوا ساگ. دودھ میں پکا ہوا گوشت. لسی. مکھن. شہد"۔

آصفہ بولی۔ "ان باتوں کو چھوڑیئے۔ سوال یہ ہے کہ وہ یہاں کیوں آ رہے ہیں۔ وہ تو فارم پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ ہمیں پینڈو سمجھتے تھے"۔

اس پر رفیق نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ مجھے "تو پینڈو ہونے پر فخر ہے۔ اچھا ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔ میں انہیں اپنی یہ حیثیت دکھاؤں گا۔ اگر کچھ دیر یہاں ہمارے ساتھ رہیں تو

شاید سبز پتے کا سحر ان پر بھی اثرانداز ہو جائے"۔

اعظم علی کی آمد پر فارم قہقہوں سے گونج اٹھا۔

رفیق نے انہیں فارم کی ایک ایک چیز دکھائی۔

اعظم علی کی بیوی بانو تو رسمی طور پر واہ واہ کرتی رہی لیکن ان کی اکلوتی بیٹی اسماء حیرت سے ایک ایک چیز دیکھتی، تالیاں بجاتی اور قہقہے لگاتی رہی۔

اسماء شفیق سے کافی بے تکلف رہتی تھی جیسے کزن ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ کبھی فارم پر نہیں آئی تھی لیکن شفیق جب بھی شہر جاتا انہی کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اسماء ہمیشہ اس کے سبز پتے کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ کہتی۔ "تمہارا ابھی جواب نہیں۔ فیقو! لوگ پھول کی تلاش کرتے ہیں اور تم سبز پتے کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو"۔ وہ شفیق کو فیقو کہہ کر بلایا کرتی تھی۔

اسماء ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ جیسے کالج والیاں ہوتی ہیں۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے بات کہہ دینا آتا تھا۔ بات میں ایسا رنگ بھر دیتی کہ وہ رنگ پچکاری بن جاتی اور محفل کو شرابور کر دیتی۔ وہ جھینپنے یا جھجکنے سے قطعی طور پر ناواقف تھی اور اس کی گفتگو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ برملا سچی بات کہہ دیتی چاہے بات خود اس کے خلاف جاتی۔

ماڈرن لڑکی کی طرح اس کے خدوخال جاذب تو تھے مگر انہیں حسین نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کی حرکات اور انداز بہت جاذب نظر تھے۔ آج کل خدوخال کا حسن نہیں چلتا۔ انداز کا حسن چلتا ہے۔ اسماء کے انداز میں بڑی گریس تھی۔ حرکت میں ردھم تھا اور بات میں رنگ۔

شفیق اسماء کو بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ وہ کمپفرٹس میں پلی ہے اور یوں زندگی بتانے کی آرزو مند ہے جیسے جھیل میں اگا ہوا کنول ہو۔ اس میں جدوجہد کی آرزو نہیں۔ زندگی مقصد سے خالی ہے، بے گانہ ہے۔

اس روز اسماء کو فارم دکھاتے ہوئے اس نے بڑی کوشش کی کہ اسماء کے دل میں سبز پتے کی جوت جگا دے مقصد کا دیا جلا دے لیکن جھیل میں اگا ہوا کنول گرد وپیش سے متاثر نہ ہوا۔ اپنے ہی عکس کو دیکھنے میں کھویا رہا۔

رات پڑی تو بڑے بھائی نے رفیق کو اپنے کمرے میں بلایا۔ کہنے لگے۔ "دیکھو رفیق! تم نے اپنی زندگی تو سبز پتے کے لئے تباہ کر دی اب کم از کم شفیق کی زندگی کو تو بچا لو"۔ رفیق نے کہا۔ "بھائی جان! میری زندگی تباہ تو نہیں میں تو جنت میں رہتا ہوں"۔

اعظم علی ہنسے. بولے۔ "اب احمقوں کی جنت سے باہر نکلو۔ رفیق! حقائق کی دنیا کو اپناؤ۔ تمہارا شہر کو چھوڑ کر یہاں فارم میں آ بیٹھنا زندگی سے فرار کے مترادف ہے۔ خیر تم نے جو چاہا کر گزرا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اسے چھوڑو۔ اب شفیق کی زندگی کا سوال ہے اگر وہ بھی اسی فارم میں بیٹھا رہا تو زندگی سے ایڈجسٹ کرنے کی صلاحیت سے محروم رہ جائے گا"۔

رفیق نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اعظم علی نے اسے چپ کرا دیا۔ بولے۔ "میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ تم شفیق کو ہمارے ساتھ شہر بھیج دو۔ ہم اسے بزنس کی ٹریننگ دیں گے اور اپنا حصہ دار بنا لیں گے۔

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کہنے لگے۔ "تمہیں معلوم ہے کہ اسمارہ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ اگر شفیق بزنس میں چل نکلا تو شاید ان دونوں کی شادی ہو جائے ــــ لیکن اسے وعدہ مت سمجھنا ــــ شاید ــــ بہرحال ہماری خواہش ہے کہ شفیق ہمارے ہاں رہے۔ یہاں فارم میں رہ کر اپنی زندگی تباہ نہ کرے اور ہاں. کل رات تک ہم اس کا جواب چاہتے ہیں۔ ہاں یا نہ۔ چونکہ پرسوں صبح ہم واپس چلے جائیں گے"۔

رفیق بڑے بھائی سے مل کر اپنے کمرے میں واپس آیا تو آصفہ سے بحث چھڑ گئی۔ آصفہ اس صورت حال پر بہت خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شفیق چچا کی خواہش کے مطابق شہر چلا جائے۔ کاروبار میں حصہ دار بن جائے اور اسمارہ سے اس کی شادی ہو جائے۔

رفیق آصفہ کا ہم خیال نہ تھا۔ نہیں۔ وہ بولا۔ شفیق نہیں مانے گا۔ وہ کسی صورت اپنا مقصد حیات نہیں چھوڑے گا۔ اسے روپیہ کمانے کا شوق نہیں۔ کچھ کر دکھانے کا شوق ہے۔

آصفہ بولی۔ "آپ اسے شہ دیتے ہیں نا"

"نہیں نہیں" رفیق نے جواب دیا۔ "اگر شفیق کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہے

تو مجھے قطعی اعتراض نہیں ہو گا۔ میں اس معاملے میں دخل نہیں دوں گا"۔

آصفہ کہنے لگی۔ "ہاں۔ آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ میں اکیلی شفیق سے بات کروں گی۔ آپ جائیں اور اسے یہاں بھیج دیں"۔

شفیق کمرے میں داخل ہوا تو ماں نے چھوٹتے ہی اس پر بھرپور جذباتی وار کر دیا۔ کہنے لگی۔ "شفیق! اب اس گھر کی عزت تیرے ہاتھ میں ہے چاہے بنا دے یا بگاڑ دے۔ تو ہاں کر دے تو دونوں بھائی پھر سے مل بیٹھیں گے اور جو تو نے نہ کر دی تو خاندان میں ہمیشہ کے لئے پھوٹ پڑ جائے گی اور تیرا ابا اکیلا رہ جائے گا۔ تنہا"

شفیق نے کہا۔ "اماں! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ بات کیا ہے؟" ماں نے اسے ساری بات سنائی۔ ساتھ ہی کہنے لگی۔ "دیکھو شفیق! تجھے اسماء سے اچھی بیوی نہیں ملے گی۔ وہ تمہیں بہت چاہتی ہے   بس اب ہماری عزت تیرے ہاتھ میں ہے"۔

ماں کی جذباتی اپیل سن کر شفیق کشمکش میں پڑ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہی کرے جو ماں باپ چاہتے ہیں اور اپنے مقصد حیات کو ان کی خاطر قربان کر دے لیکن کچھ دیر کے بعد اس کے سامنے ایک خوفناک مستقبل کا نقشہ کھنچ جاتا۔ ایک بے حس سرمایہ دار ابھرتا جس کا مقصد حیات صرف دولت اکٹھی کرنا تھا۔ وہ لرز جاتا۔ اور اس کا فیصلہ پھر سے ڈگمگا جاتا۔

گھبرا کر وہ اپنے کمرے سے باہر لان میں نکل گیا۔ لان چاندنی سے بھرا ہوا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ لیکن اس رات وہ منظر کے حسن سے بے خبر تھا۔ رات دیر تک وہ لان میں بے تابانہ ٹہلتا رہا۔ سوچتا رہا۔

دفعتہً وہ چونکا۔ رک گیا۔

اس کے سامنے وہ چادر میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔

"تم تو کہتے تھے یہ فارم تمہاری جنت ہے"۔ وہ بولی۔

"ہاں۔ جنت ہی تو ہے"۔

"کیا جنت میں لوگ یونہی بے قرار رہتے ہیں جیسے کہ تم ہو"۔ وہ ہنسی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ایک گھنٹے سے میں اپنی کھڑکی سے تمہاری بے چین ٹہل کو دیکھ رہی تھی۔ اسارہ

نے کہا۔ "پھر میں نے سوچا چلو پوچھوں تو"

"دیکھو اسارہ" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "اس وقت میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوں"

وہ ہنسی. بولی۔ "ہاں ایک طرف سبز پتا ہے دوسری طرف پھول ہے۔ کتنی مشکل میں گرفتار ہو تم۔ تت تت تت"۔

"بات مذاق میں نہ ٹالو۔ اسارے! وہ بولا۔ "میری مدد کرو"۔

"بولو۔ کیسے"؟

"کیا تم میرا جیون ساتھی بنو گی اسارے"۔ اس نے پوچھا۔

اسارہ کی بھویں تن گئیں۔ آنکھ میں پھلجھڑی چل گئی۔ زبان گال میں ٹھونس کر بولی۔ "اچھ! تو پروپوز کر رہے ہو۔ اونہوں۔ ہوں. یوں نہیں۔ دونوں پاؤں ملاؤ۔ گھٹنے زمین پر ٹیش دو پھر ہاتھ اٹھاؤ۔ اور کہو ڈارلنگ کیا تم میرا جیون ساتھی بننا قبول کرو گی"؟ اس کا قہقہہ لان میں گونجا۔

وہ پتھر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بولا۔ "یو آر امپاسی بل"

"ہاں" وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی "یہی چیلنج تو ہے۔ امپاسبل کو پاسبل بنانا ہے۔ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ ذرا سی محنت درکار ہے۔ گھبراؤ نہیں فیقو۔ پھول توڑو گے تو کانٹا تو چبھے گا"۔

وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر خاموش ٹہلتی رہی پھر قریب آکر رک گئی۔ بولی۔ "فیقو پتا اور پھول ایک ہی ٹہنی پر لگتے ہیں۔ مگر دونوں آپس میں کبھی نہیں ملتے۔ پھول کو پانا ہو تو پتا نہیں بھنورا بنو"۔ یہ کہہ کر وہ خراماں خراماں ٹہلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔

شاید اس کی خواہش تھی کہ وہ اٹھ کر اس کو روک لے لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا رہا۔

اگلی صبح ان کا ملازم گھبرایا ہوا رفیق کے کمرے میں داخل ہوا۔ بولا جی "چھوٹے چودھری اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے رات کو بستر میں نہیں سوئے"۔

رفیق یہ سن کر گھبرا گیا۔ بھاگا بھاگا شفیق کے کمرے میں گیا۔ وہاں کتابوں کے

شلف پر ایک خط پڑا تھا۔ لکھا تھا۔

"پیارے ابا جان۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا مقصد حیات چھوڑ نہیں سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ چچا اور آپ کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کا باعث بنوں اس لئے میں جا رہا ہوں۔ آپ چچا جان کو بتا دیجئے کہ مجھے آپ کی بات منظور نہ تھی لہٰذا میں گھر چھوڑ کر چلا گیا"۔

اعظم علی کو اس حادثہ کا پتہ چلا تو وہ ناراض ہو کر اسی روز شہر واپس چلے گئے۔

رفیق نے بیٹے کو ڈھونڈنے کی دیوانہ وار کوششیں کیں لیکن سب ناکام رہیں۔ آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اور اس جنت میں یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے جیسے جنت سے نکالے ہوئے ہوں

ایک سال گزر گیا۔

ایک روز جب رفیق چپ چاپ حسب دستور باہر دھوپ میں بیٹھا تھا تو ایک اجنبی داخل ہوا۔ چودھری کے قریب آ کر اس نے سلام کیا۔ بولا آپ رفیق علی چودھری ہیں کیا"؟

رفیق نے اثبات میں سر ہلایا۔

نووارد بولا۔ "میں کاکڑیاں کے رکھ سے آیا ہوں۔ ہمارے صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے آپ کو بلایا ہے"۔

"مجھے بلایا ہے" رفیق نے حیرت سے کہا۔

"جی" وہ بولا۔ "صاحب نے کہا تھا چودھری صاحب کو ساتھ لے آنا۔ ان سے کہنا کہ آپ کا بیٹا بہت بیمار ہے"۔

"شفیق بیمار ہے"۔ چودھری گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"وہ شفیق نہیں"۔ نووارد نے کہا وہ تو ہمارا گارڈ اکبرا ہے۔ وہیں رکھ میں کام کرتا ہے"۔

"رفیق از سر نو گھبرا گیا"۔ "اکبرا" وہ بولا۔

نووارد نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور چودھری کو تھما دی۔ بولا۔ "صاحب نے کہا تھا یہ تصویر دکھا دینا"۔

تصویر میں ایک پینڈو وردی پہنے کھڑا تھا۔ منہ پر گھنی داڑھی اور مونچھیں تھیں اور سر کے بال یوں کھڑے تھے جیسے کانٹے ہوں۔

کاکڑیاں کے رکھ میں پہنچ کر وہ شخص چودھری کو سیدھا صاحب کے پاس لے گیا۔

"آپ رفیق علی چودھری ہیں" صاحب نے پوچھا۔

رفیق نے اثبات میں سر ہلایا۔

"شاہ کوٹ کے فارم سے آئے ہیں کیا"

"جی" صاحب وہ بولا۔

صاحب نے اپنے جیب سے تصویر نکالی۔ "آپ نے یہ تصویر دیکھی ہے کیا"

"جی" وہ بولا۔ "یہ میرا بیٹا ہے"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ وہ بیمار پڑا ہے۔ دس دن سے بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ آپ کو ابھی اس سے نہیں ملنا چاہئے۔ آپ دو چار دن میرے پاس رہیں پھر وہ صحت مند ہو جائے گا تو اسے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔

"آپ کو میرا پتہ کیسے ملا" ۔ چودھری نے پوچھا۔

"اس کے کمرے سے ایک پرانا لفافہ ملا تھا اس پر آپ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ دراصل شروع سے ہی ہم اکبرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب وہ گارڈ بھرتی ہونے کے لئے آیا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ لیکن اس نے اپنے کوائف چھپائے رکھے۔ ہم نے تو اسے کلرک بنانے کی پیشکش کی تھی لیکن وہ نہ مانا" ۔

"یہاں ہمارا ہیڈ گارڈ قادرا ہے۔ اس کی ایک نوجوان لڑکی ہے مومی۔ وہ یہاں رکھ میں مومی کے ساتھ صبح و شام گھوما کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے قادرا سے کہا کہ مومی کو اپنے گاؤں میں بھیج دے ورنہ تیری بدنامی ہو جائے گی۔ بس جس روز سے وہ لڑکی گئی ہے اس روز سے یہ ڈانواڈول پھرتا رہا ہے۔ میں نے مومی کو گاؤں سے بلوایا ہے تاکہ آپ اس کی زبانی ساری بات سن لیں" وہ رک گیا۔

پھر بولا۔ "ان لوگوں کے سامنے یہ ظاہر نہ کریں کہ آپ اس کے باپ ہیں بلکہ یہ کہیں انکوائری کرنے کے لئے ہیڈ آفس سے آئے ہیں" ۔

عین اس وقت قادر اپنی بیٹی موی کے ساتھ داخل ہوا۔ "بیٹھ جاؤ لڑکی" صاحب بولا۔ قادر اتم چلو۔ قادر اباہر نکل گیا لیکن موی جوں کی توں کھڑی رہی۔

وہ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔ پتلی دبلی لیکن بڑی شوخ۔ طبیعت میں جھجھک نام کو نہ تھی۔

"بیٹھ جا" صاحب نے کہا۔

"نہ" وہ بولی۔ "ماں نہیں بیٹھتی۔ ماں ایسے ہی ٹھیک ہوں"۔

صاحب نے کہا۔ "دیکھ یہ جو صاحب بیٹھے ہیں"۔ اس نے رفیق کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بڑے دفتر سے آئے ہیں۔ اکبرا گاڈ کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے۔ تجھے اکبرے کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے سچ سچ بتا دے۔ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے سب کچھ"۔

لو موی بولی۔ "صاحب جی مجھے کیا پتہ کہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ بارہ چودہ مہینے ہوئے۔ وہ ادھر رکھ میں بیٹھا تھا۔ ماں جو ادھر سے گجری تو بولا۔ ادھر نیڑے نیڑے کوئی گاؤں ہے کیا۔

مَنے کہا ادھر کوئی گاؤں نہیں۔ جنگل کے صاحب کا دیہرہ ہے بس وہ بولا مجھے رات گجارنی ہے۔ اس پر مجھے ترس آگیا۔ ماں وسے باپو کے پاس لے آئی۔ باپو نے کہا اسے توڑی والے جھونپڑے ماں ڈال دے۔

اگلے روج بابو نے پچھارے۔ تیرا آگے پیچھے کوئی ہے۔ وہ بولا۔ نہیں کوئی نہیں۔ پھر باپو نے پچھیارے تو نوکری کرے گا۔ وہ بولا کروں گا۔ اس پر باپو وسے آپ کے پاس لے آیا۔ ادھر اک گارڈ کی جگھوں کھالی تھی۔ آپ نے وسے گارڈ رکھ لیا۔ چلو بات دیہہ ہوئی۔ رہنے کو کوٹھڑی مل گئی۔

پر صاحب جی وہ اکبرا تو پاگل نکلا۔ ایک دم پاگل۔ وسے سبج بوٹے کا پاگل پنا لگا تھا۔ مجھ سے بولا۔ موی مجھے ایسا سبج پتا ڈھونڈ دے جو جمین ماں جڑیں گاڑ دے ایکی جڑھیں گاڑ دے کہ وہ سوکھیں نہیں۔ سدا ہری رہیں چاہے برکھا ہو نہ ہو۔ پانی ملے نہ ملے۔ اور یہی نہیں صاحب جی وہ چاہے تھا کہ ایسا سبج پتا ہو جو سبھی پر پھیلتا جائے۔ پھیلتا جائے جڑھیں گاڑتا جائے گاڑتا جائے۔

لو۔ صاحب جی یہ کوئی ڈھونڈ تھی کیا۔ یو تو شدائی پنا تھا۔ اور صاحب جی آپ سے جھوٹ کیوں بولوں مجھے وس کے پاگل پنے پر ترس آ گیا۔ ماں رکھ کی دیوانی تو پہلے سے ہی تھی اس لئے اس کے ساتھ مل کر سے پتا ڈھونڈن لگ گئی۔ اٹھ مہینے ہم دونوں صبح شام اندھیرے سویرے ہروخت رکھ ماں وہ سے پتا ڈھونڈتے پھرے۔

سچی بات یو ہے صاحب جی کہ وہ پاگل پنا جو وس کا تھا وہ مجھے بھی لگ گیا۔ بس دن رات۔ رات دن ہروخت ایک دھن سوار تھی۔

ویسے صاحب جی یو بات تو پہلے روج سے ہی جان گئی تھی کہ اکبرا ہم ماں سے نہیں۔ وہ وکھرا وکھرا دکھے تھا۔ وسکی باتاں وکھری وکھری تھیں وسکی رہت بہت وکھری تھی۔ وس نے یہاں آ کر منہ دھونا چھوڑ دیا۔ داڑھی بڑھالی۔ سر کے وال یوں کھڑے کر لئے جیسے کانٹے ہوں۔ وس نے ہم سا بننے کے سارے جتن کئے پر وہ ہم سا نہ بن سکا۔ پر ایک بات ہے صاحب جی وہ مجھ سے اتنا گھل مل گیا جیسے میرے ساتھ کھیل کھیل کر بڑا ہوا ہو۔ مجھے ایسے لگنے لگا جیسے وہ میرا باپن کا ساتھی ہو۔ جرا وکھرا نہ لگے تھا مجھے۔

صاحب جی ہم نے جھاڑیوں تلے گھس گھس کر وہ سے پتا ڈھونڈا۔ کانٹوں والی بیلوں میں ڈھونڈا۔ رکھ کے درکھتوں پر چڑھ کر ڈھونڈا"۔

"پھر وہ تمہیں ملا بھی" صاحب نے پوچھا۔

"مل گیا صاحب جی مل گیا۔ پر وہ بوٹا نہ تھا۔ پتا نہ تھا وہ اک ویل تھی جو جمین کے ساتھ ساتھ سنپولئے کی طرحیوں ریکے تھی اور پوٹے پوٹے پر جمین میں جڑھیں گاڑ دے تھی۔ وہ ویل ہم نے چار پانچ جگھوں پر لگا دی۔ چار جگھوں پر رکھ ماں اور پانچویں جگہ اکبرے کی کوٹھڑی سے باہر۔ اور ماں نے وسے بتا دیا کہ جد توڑی اس ویل کی ڈنڈی پر اک پتی بھی ٹکی رہے گی ویل مرے گی نہیں۔

پھر صاحب جی باپو میری اوارہ گردی پر غصے ہو گیا بولا۔ ری تو اس گاڈ کے ساتھ ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ گاؤں میں برادری والے باتیں کرنے لگے ہیں۔ یا تو تو اس کے ساتھ گھومنا پھرنا چھوڑ دے نہیں تو ماں تجھے گاؤں بھیج دوں گا۔

میں نے باپو سے کہا نہ باپو وس کے ساتھ گھومنا پھرنا نہیں چھوڑوں گی۔ بے شک تو مجھے گاؤں میں بھیج دے۔

غصے میں بابا نے مجھے گاؤں بھیج دیا۔ پر جانے سے پہلے منے اکبرے سے کہہ دیا۔ منے کہا اکبرے دیکھ پت جھڑ کے دن آ رہے ہیں۔ گھبرا نہ جاییو۔ جد توڑی اک بھی ویل پر لگی رہے گی تد تک جڑ نہیں سوکھے گی"۔

صاحب بولا موی تجھے پتہ ہے اکبرا تو اس دس روز سے چارپائی پر پڑا ہے۔ بیمار ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے"۔

"ہے اللہ"۔ وہ چلائی۔ پھر بولی۔ "نہیں نہیں صاحب جی وسے کوئی بیماری نہیں۔ بس وس کی ویل کا پتا سوکھ گیا ہو گا۔ ماں ابھی دیکھ کر آئی"۔ یہ کہہ کر وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی۔ "منے کہا نہ تھا وسکی ویل کا پتا سوکھ گیا ہو گا۔ اور وہ پتے کے غم میں سوکھ رہا ہو گا۔ منے جا کر دیکھا تو اکبرے کے کواٹر کی ویل سوکھی وی تھی۔ پھر ماں رکھ کو بھاگی۔ ادھر جا کر دیکھا تو چاروں جگہوں کی ویل ہری بھری تھی۔

پھر ماں اکبرے کے پاس گئی منے کہا رے تو تو بچ پاگل ہے۔ غم لگانے سے پہلے رکھ ماں جا کر وہاں کی ویلیں تو دیکھ لی ہوتیں وہ تو ہری بھری ہیں رے۔ ماں دیکھ آئی ہوں۔ چل تجھے دکھادوں۔

مجھے دیکھ وہ اٹھ بیٹھا بولا۔ سچی مچی ہری بھری ہیں۔

منے کہا اور کیا ماں تجھ سے جھوٹ بولوں ہوں"۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسی پھر وہ دروازے کی طرف دیکھ کر چیخی "رے تو کیوں آ گیا میرے پیچھے پیچھے"۔

صاحب اور چودھری نے مڑ کر دیکھا۔

دروازے میں شفیق کھڑا تھا اس نے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا۔

"چل اب جا کر پڑ جا اپنی کھاٹ"۔ پر موی نے اسے ڈانٹا۔

لیکن وہ حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دو ہاتھ

توبہ ہے۔ میں تو کسی جوگی نہ رہی۔ اپنی نظر سے گر گئی۔

اس روز چانن ویراں پنچائیت کے کہنے پر بیگاں تیلن کا بیان لے رہی تھی کہ اس نے زیر لبی میں وہ بات کہہ دی۔ سن کر میرا تو دل ہی ڈوب گیا۔ ایسا لگا جیسے بیگاں نے میرا بھانڈہ پھوڑ دیا ہو۔ مجھے ننگا کر دیا ہو۔ میری اصلیت کو میرے روبرو لا کر کھڑا کر دیا ہو۔

ویسے میں خود کو جانتی تو تھی۔ لیکن ڈھکے چھپے اندر ہی اندر۔ زندگی میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آپ جانتے تو ہوتے ہیں مگر جاننا چاہتے نہیں۔ اس لئے جان بوجھ کر ان جانا کر دیتے ہیں۔ کئے رکھتے ہیں۔

اک اندر کی سرگوشی کو میں سنتی تو تھی لیکن ان سنا کر دیتی تھی۔ اندر کی بات باہر سر نکالتی تو میں جھٹ سے اس پر دبیز پردہ ڈال دیتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اندر کی بات باہر نکلے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا راز مجھ پر فاش ہو جائے۔

چانن ویراں میں میرے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان کے اس قدر دور و دراز کونے میں بھلا کون جاتا ہے۔ وہ تو میرے میاں نے چانن ویراں میں میرے نام کے دو مربعے خرید لئے اور مجھے حکم نامہ بھیج دیا کہ سلطان کے ساتھ جاؤ اور وہاں جا کر قبضہ لے لو۔ میاں خود تو لمبے دوروں پر رہتے تھے۔ خطوں میں حکم چلاتے رہتے۔ اور پھر سلطان کے ساتھ جانا تو مجھے بالکل قابل قبول نہ تھا۔

سلطان میرا دیور ہے۔

دونوں بھائیوں میں کتنا فرق ہے۔ نومان تو مخملی آدمی ہے۔ گڈی سے ہاتھ پاؤں اور پتلی سا جسم اس کے برعکس سلطان جیسے سوٹ میں جاٹ لپٹا ہوا ہو۔ بڑے بڑے ہاتھ۔ بازو مچھلیاں ہی مچھلیاں۔ بھرا بھرا جسم۔

جب میں نئی نئی بیاہی ہوئی گھر میں آئی تھی تو پہلے تو میں سلطان کو دیکھ کر ڈر گئی۔

اس کے بعد آج تک میں نے نظر اٹھا کر سلطان کی طرف نہیں دیکھا۔ پر کیا کروں لاکھ نظریں جھکائے رکھوں. ہاتھ اور بازو تو اوجھل نہیں ہوتے نا۔ پھر یہ ہوا کہ سلطان کہ ہاتھ اور بازو میرا پیچھا کرنے لگے۔ خواب میں میری طرف بڑھتے۔ بازو گھیرے میں لینے لگتے۔ میں چیخ کر اٹھ بیٹھتی۔ نومان پوچھتے کیا ہوا۔ اب میں انہیں کیا بتاتی۔ پھر وہ بازو اور ہاتھ جاگتے میں میرے کمرے میں تیرنے لگے۔ جب نومان باہر دورے پر ہوتے تب۔ اور وہ اکثر دورے پر رہتے تھے۔ صرف سلطان ہی کی بات نہ تھی۔ بازار جاتی تو انجانے میں لوگوں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہتی۔ بڑے بڑے ہاتھ دکھائی پڑتے تو ایک دھچکا سا لگتا۔ یوں جیسے اندر کوئی ہوائی سی چھوٹ گئی ہو۔

پھر ادھر نہ دیکھنے کی شدید کوشش کرتی۔ اتنی شدید کہ تریلیاں چھوٹ جائیں۔ جیسے کسی نے اندر کی ساری جان نچوڑلی ہو۔

بات تو سامنے دھری تھی۔ پر میں اسے جاننا نہیں چاہتی تھی۔ ڈرتی تھی کہ اگر میں نے اسے جان لیا. مان لیا تو بوتل سے جن نکل آئے گا۔ پھر کیا ہو گا۔

چانن ویراں جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ریل سے جاؤ تو پہلے مین لائن پر سو سوا سو میل سفر کرو پھر گاڑی بدلو اور برانچ لائن پر ۶۰ میل سفر کرو۔ وہاں سے ریل ختم سڑک شروع جیابگا روڈ پر ۴۵ میل کا سفر کرو۔ پھر ڈنگے پل سے کچی سڑک پر ۳۰ میل جاؤ پھر کہیں چانن ویراں پہنچو۔ ریل پر جانا ممکن نہ تھا ۷۵ میل سڑک کا سفر کیسے ہوتا لیکن سلطان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر ۲۶۰ میل کا سفر کرنا میرے لئے بے حد مشکل تھا۔ سوچتی رہی، سوچتی رہی کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اسی عالم میں ایک روز نومان کا فون آ گیا۔ پھر تو جانا ہی پڑا۔ دل کڑا کیا۔ آنکھوں پر کالے کھوپے چڑھا لئے اور کار میں پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ سلطان نے آگے بٹھانے کے لئے بڑی منتیں کیں۔ سب ان سنی کر دیں۔

راستے میں ایک سہیلی کے گھر رات کاٹی۔ صبح منہ اندھیرے چل نکلے۔ دوپہر کو چانن ویراں جا پہنچے۔ خیال تھا کہ شام کو وہاں سے واپس آ جائیں گے۔

چانن ویراں میں محمد علی مل گئے۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا اور گھر لے گئے۔ محمد علی عائشہ کے باپ ہیں۔ کالج میں عائشہ میری روم میٹ سہیلی تھی۔ محمد علی اسے ملنے آیا کرتے تھے۔

اتفاق سے ان دنوں عائشہ بھی چانن ویراں میں آئی ہوئی تھی۔ دو پرانی سہیلیاں مل گئیں۔ سب پروگرام تہس نہس ہو گئے۔

وہاں پہلی بار میں نے بیگاں تیلن کو دیکھا

میں تو اسے دیکھ کر ہکی بکی رہ گئی کہ یہ مغلیہ دربار کی گاؤں میں کیسے آ گئی۔ اس قدر باوقار حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گاؤں کی تو لگتی ہی نہ تھی۔

عائشہ نے کہا یہ تو گاؤں کی تیلن ہے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ اور میں قبضہ لینے کے سلسلے میں پھر سے مصروف ہو گئی۔

چانن ویراں میں آنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ زمین کا قبضہ لینا ایسے ہی ہو گا جیسے دفتر میں چارج لیتے ہیں لیکن وہ تو لمبا بکھیڑا نکلا۔ میں نے سلطان کو واپس بھیج دیا اور فیصلہ کر لیا کہ قبضہ لے کر ہی واپس جاؤں گی۔ چند دنوں کے بعد عائشہ کے ابا آئے۔ کہنے لگے اسل بیٹے! ہمارا ایک کام کر دو۔ یہ کام کسی گاؤں والے کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ جانبداری کا الزام لگنے کا خطرہ ہے۔

میں حیران ہوئی کہ ایسا کون سا کام ہے ـــ وہ بولے ہمارے گاؤں میں ایک لڑکی ہے بیگاں۔ اس کا مقدمہ گاؤں کی پنچایت کے پاس زیر غور ہے۔ وہ لڑکی بڑی شریف اور بے زبان ہے۔ پنچایت کے سامنے بات نہیں کرتی۔ تم اس سے مل کر اس کا بیان لے لو۔ تم گاؤں کی نہیں ہو شاید تمہارے سامنے بات کر دے۔ اس طرح پنچایت کے لئے فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ باقی باتیں تمہیں عائشہ بتا دے گی۔

عائشہ کہنے لگی۔ بیگاں کی کہانی بڑی مختصر سی ہے۔ بیگاں کے ماں باپ پاکستان بننے کے وقت ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ پتہ نہیں کہاں سے آئے تھے۔ یہاں چانن ویراں میں کیسے آ پہنچے۔ گاؤں والوں نے ایک بیٹھک انہیں رہنے کے لئے دے دی۔ کچھ دیر باپ محنت مزدوری کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک کولہو خرید کر گھر کے پاس لگا لیا۔ پیچھے سے تیلی تھے۔ سو تیل کا دھندا شروع کر دیا۔ ملاوٹ نہیں کرتے تھے اس لئے کام چل نکلا اور اس نے بیٹھک کے ساتھ دو کوٹھڑیاں بنا لیں اور کولہو پر چھت ڈلوا لی۔ بیگاں یہیں پیدا ہوئی۔ یہیں بڑی ہوئی۔ بڑی ہوئی تو ایسی شکل نکالی کہ جو دیکھتا. دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس پر ماں باپ نے اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ پھر ایک رات بھونچال آیا۔ بیٹھک کی چھت

گر گئی ماں اور باپ دونوں مر گئے۔ بیگاں بیٹھک کے ساتھ والی کوٹھڑی میں تھی اس لئے بچ گئی لیکن بیچاری اکیلی رہ گئی۔ گاؤں والوں نے بڑی منتیں کیں کہ اکیلی نہ رہ۔ ہمارے گھر آ جا۔ مگر اس نے کسی کی نہ مانی۔ جب سے وہ بیٹھک میں ہی رہتی ہے گاؤں کی آبادی سے ہٹ کر تن تنہا۔

اتنی شریف لڑکی ہے کہ میں کیا کہوں۔ عائشہ بڑے جذبے اور جوش سے بولی۔ آج تک کبھی آنکھ اٹھا کر اوپر نہیں دیکھا۔ کوئی سامنے کھڑا ہو کر طعنے دے، الزام لگائے، بیگاں نے کبھی جواب نہیں دیا۔ جب تک ضروری کام نہ ہو گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ بڑی بدنصیب ہے بیچاری۔ عائشہ خاموش ہو گئی۔

"بدنصیب کیوں"۔ میں نے پوچھا۔

پہلے گاؤں کے جوان بیٹھک کے پھیرے لیتے رہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے پھٹکارا تو وہ پیچھے ہٹ گئے پھر ارد گرد کے گاؤں کے جوان آنے لگے۔ بیچاری بڑی مصیبت میں پڑی ہے۔ جو بھی دیکھتا ہے اس کی آنکھیں پھٹ جاتی ہیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔" میں نے کہا۔ میں نے اسے دیکھا ہے نا" عائشہ بولی۔ ایک رات ایک جوان نے دیوار پھلانگی پھر کھڑکی توڑ کر کوٹھڑی میں جا پہنچا۔

"پھر کیا ہوا۔" میں نے پوچھا۔

بیگاں نے اس کی کلائیاں پکڑ لیں اور پھر رسے سے اسے باندھ دیا۔ پھر اس نے بڑے پنچ کا دروازہ جا کھڑکایا۔ سبھوں نے جوان کو دیکھا تو حیران رہ گئے۔ نہ تو وہ اپنے گاؤں کا تھا نہ اڑوس پڑوس کے گاؤں کا۔ پھر کسی نے کہا یہ تو جیرے ڈاکو کا ساتھی ہے۔ اس پر پنچ ڈر گئے اور انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔

"بغیر سزا کے چھوڑ دیا" میں نے پوچھا۔

"بغیر سزا کے۔" گاؤں والے ڈر گئے کہ جیرا ڈاکو بدلہ نہ لے۔ جیرے کا نام سن کر سارے علاقے کے لوگ تھر تھر کانپتے ہیں۔ بڑا بے رحم اور انتقامی ہے وہ۔ سارے گاؤں والے ڈرے ہوئے تھے کہ پتہ نہیں جیرا کیا کرے گا۔

پر اگلے روز صبح سویرے گاؤں والے حیران رہ گئے۔ وہ ڈاکو جوان گاؤں کے چوگان کے درخت سے بندھا ہوا تھا اور اس کے منہ پر توے کی کالک لگی ہوئی تھی۔ اسے

جیرا ڈاکو یہاں چھوڑ گیا تھا۔ کیا "میں" نے پوچھا۔ پتہ "نہیں کون چھوڑ گیا تھا۔" عائشہ نے کہا۔

"پھر کیا ہوا" میں نے پوچھا۔

پھر کہیں گاؤں کے چودھری کے چھوٹے بیٹے نے بیگاں کو دیکھ لیا۔

"پہلے نہیں دیکھا تھا" کیا میں نے پوچھا۔

بولی۔ چودھری اس گاؤں میں نہیں رہتا۔ وہ تو چھ میل دور اوچی ماڑی میں رہتا ہے اور اس کا بیٹا تو پڑھنے کے لئے شہر گیا ہوا تھا۔ جب سے اس نے بیگاں کو دیکھا ہے روز بیگاں کو ایک نا ایک تحفہ بھیجتا رہتا ہے۔ آج خوشبو کی شیشی. کل اپنے باغ کے مالٹے۔ کبھی بالوں کا تیل کبھی شیمپو۔ بیگاں تحفے لوٹا دیتی ہے۔ چھوٹے چوہدری کے آدمی زبردستی بیگاں کے دروازے پر پھینک جاتے ہیں اور بیگاں انہیں اٹھا کر بڑے پنچ کے گھر دے آتی ہے۔

اب چھوٹے چودھری نے ایک اور چال چلی ہے۔ اس نے بڑے چودھری سے کہلوا بھیجا ہے کہ اوچی ماڑی میں کوئی تیلی نہیں۔ لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے بیگاں تیلن اپنا کولہو اوچی ماڑی میں لے آئے۔

ہم اسے زمین دیں گے. مکان دیں گے۔ کولہو لگوا دیں گے۔ بیگاں بھی بڑی ضدی ہے۔ عائشہ نے ہنس کر کہا۔ کہتی ہے میں نہیں جاؤں گی۔

چھوٹے چودھری نے پنچایت کو کہلوا بھیجا ہے کہ بیگاں نے آنے سے انکار کیا تو ہم اس کا کولہو اکھاڑ کر زبردستی اوچی ماڑی لے آئیں گے۔

ادھر جیرے ڈاکو کو بھی خبر مل گئی ہے۔ اس نے بیگاں کو کہلوا بھیجا ہے کہ فکر نہ کر۔ کسی نے تیرے کولہو کو ہاتھ لگایا تو اسکے ہاتھ کاٹ دوں گا۔ اس پر گاؤں والے ڈر گئے ہیں۔ ایک طرف چھوٹا چودھری ہے دوسری طرف جیرا ڈاکو۔ ظاہر ہے کہ فساد ہو گا۔

پنچایت والوں نے سوچ سوچ کر فیصلہ کیا ہے کہ بیگاں کا بیاہ کر دیا جائے۔ انہوں نے گاؤں کے سنیارے کے بیٹے رحمت علی کو رضامند بھی کر لیا ہے۔

"اب مسئلہ کیا ہے۔ کس بات پر بیگاں کا بیان لینا ہے" میں نے پوچھا

"بس اسے رحمت علی سے بیاہ کرنے پر رضامند کرنا ہے" عائشہ نے کہا۔ "کسی

کی ہو جائیگی تو یہ جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ "

" پنچائت خود کیوں نہیں پوچھ لیتی بیگاں سے " میں نے کہا۔ " انہوں نے بیگاں کو پنچایت میں بلایا تھا۔ اسے ساری بات سمجھائی تھی۔ پر بیگاں نے جواب نہیں دیا بس نگاہیں جھکا کر چپ چاپ کھڑی رہی۔ تو اس سے بات کر لے۔ " عائشہ نے کہا۔ تو تو بھید لینا جانتی ہے۔ میں بیگاں کو بلا لیتی ہوں۔ "

" اونہوں۔ " میں نے جواب دیا۔ " میں خود اس کے گھر جاؤں گی۔ " اگلے روز میں نے تیل کی ایک خالی کپی اٹھائی اور بیگاں کا دروازہ جا کھڑکایا۔

" کون ہے " وہ بولی۔ آواز سے ظاہر تھا کہ کھانا کھا رہی ہے۔ میں نے کہا۔

" میں ہوں۔ "

بولی۔ " میں کون ؟ "

میں نے کہا " تیل لینے آئی ہوں "

اس نے دروازہ کھولا۔ میری طرف دیکھا اور شک سے دیکھا۔ " کہاں سے آئی ہے ؟ "

" مہمان ہوں۔ شہر سے آئی ہوں "

" تجھے دیکھا نہیں ادھر کبھی۔ کس کے گھر کی مہمان ہے "

میں نے اس کا سوال گول کر دیا۔ " کیا کھا رہی ہے تو؟ "

" چنے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ کھائے گی ؟ "

" ہاں کھاؤں گی۔ "

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور اٹھ کر ہانڈی سے چنے تھالی میں ڈالنے لگی۔

" اکیلی ہے تو " میں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔

" گھر والا کھیت پر گیا ہو گا؟ "

اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ تھالی میرے سامنے رکھی۔ " لے کھا " بیاہ نہیں کیا ابھی ؟ " میں نے پوچھا۔

وہ شرما گئی۔ منہ لال ہو گیا۔
اتنی سوہنی ہے تو۔ بیاہ کیوں نہیں کر لیتی۔
"یہی تو چنتا ہے" وہ بولی۔
"کیوں سوہن چنتا ہے کیا؟"
"دفع کر۔" وہ زیر لب بولی۔ "جو بھی آوے ہے کہے ہے تو مجھے اچھی لگتی ہے۔
میری ہنسی نکل گئی یہ "تو اچھی بات ہے بیگاں۔"
میں تو عاجز آ گئی اس اچھی لگتی ہے سے۔
سدھی سادی ہوتی تو ارمان سے رہتی"
"یہ چنے تو مزے دار ہیں۔" میں نے اس کا تناؤ دور کرنے کے لئے کہا۔
"تجھے اچھے لگے؟"
"بہت"
"اور دوں"
"دے"
اس کے تار ڈھیلے پڑ گئے۔
"اکیلی رہتی ہے ڈر نہیں آتا تجھے۔"
"نصیبے میں اکل جو ہوا۔ پھر ڈر کیسا"
"چور کا ڈر"
"چور کیا کرے گا۔ جو آپ چور ہو اس نے کیا کرنا ہے"
"بیگاں تو شیدے کے پتر سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔" میں نے ناگاہ وار کیا۔
اس نے برا سا منہ بنایا۔ پھر جوش میں آ گئی۔ بولی۔ "اسے میں کیا کروں گی۔ اس کے اتنے اتنے تو ہاتھ ہیں تب بیگاں نے ہاتھ کی انگلیاں دکھا کر کہا۔ اور وہ بھی اللہ مارے فلالین کے۔"
یہ سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ سلطان کے ہاتھ کمرے میں تیرنے لگے۔ کچھ دیر

تک میں سن ہو کر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر میں نے ہمت کر کے بات چلائی۔ "ہاتھوں سے کیا فرق پڑتا ہے بیگاں۔" میں نے پوچھا۔ "پتہ نہیں کیوں پڑتا ہے" وہ بولی۔ "کیا کروں لاکھ آنکھیں جھکائے رکھوں پھر بھی نظر آ جاتے ہیں ہاتھ"

میرا جی چاہا کہ بڑھ کر بیگاں کا منہ چوم لوں۔ پر میں بت بنی بیٹھی رہی۔

"سنا ہے۔" میں نے پھر بات چھیڑی "تیرے گھر اک ڈاکو آیا تھا۔" "ہاں آیا تھا" وہ بولی۔

"ہے بی بی۔ کھڑ کا سن کر جو میں جاگی تو کیا دیکھتی ہوں کہ دو بڑے بڑے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔"

"تو ڈر گئی"

"میری تو جان نکل گئی"

"پر تو نے تو ڈاکو کی کلائیاں پکڑ لیں۔ اتنی دلیری"

"دلیری نہیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے دو بھیر سانپ پھن اٹھائے حملہ کرنے والے ہوں۔ میں نے دہشت کے مارے انہیں پکڑ لیا۔۔۔ اس وقت میری پکڑ مردے کی پکڑ جیسی تھی۔ نہ پکڑتی تو ڈھیر ہو جاتی۔ پانی پانی ہو کر چھینٹے اڑ جاتے میرے"

یہ سن کر میرے اندر اک جوار بھاٹہ ابھرا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی"

"کتنا تیل ڈالوں" بیگاں نے پوچھا۔

"بھر دے" میں نے بصد مشکل کہا۔

"تلوں کا کہ سرہوں کا"

"سرہوں کا"

جب وہ تیل ڈال رہی تھی تو میں نے پوچھا "بیگاں تو شاہ ملنگ کے مزار پر جاتی ہے"

"ہاں وہ۔" بولی جمعرات کی جمعرات۔"

"کیا مانگتی ہے"

میں بیچاری کیا مانگوں گی" اس نے کہا۔ "میری مانگ تو یہ ہے کہ جو بند میں نے باندھ رکھا ہے وہ سلامت رہے۔" اس نے لمبی آہ بھری اور مدھم آواز میں۔ "بولی جو بند

ٹوٹ گیا تو نہ یہ گاؤں رہے گا نہ میں رہوں گی۔"

اگلے روز شہر واپس آتے ہوئے سلطان نے زبردستی مجھے اگلی سیٹ پر بٹھالیا۔ رہ رہ کر میری نگاہیں سٹیرنگ پر ٹک جاتیں۔ سلطان کے ہاتھ اور بازو سارے سٹیرنگ پر بچھے ہوئے تھے۔ میرا دل ڈوبے جارہا تھا۔ پگھل کر پانی ہوئی جارہی تھی۔ چھینٹے اڑ رہے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان بھیانک سانپوں کو گلے سے پکڑ کر خود کو محفوظ کر لوں۔ یہ خواہش جنون کی طرح بڑھتی جا رہی تھی۔ دفعتہً گاڑی رک گئی۔ سلطان، جسٹ اے منٹ کہہ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

میں دیوانہ وار چھلانگ مار کر سٹیرنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے بریک کھولی اور ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ میرے پیچھے دو ہاتھ دیوانہ وار میرا تعاقب کر رہے تھے۔

جگن ناتھ

مجھے بھگت نے کہا تھا۔ "جو جینا چاہتے ہو تو جگن ناتھ بن جاؤ۔ جگن ناتھ کو نہیں جانتے؟ ہمارے ہاں بادام کی اک پہیلی ہے۔ " ادھر کاٹھ ادھر کاٹھ بیچ میں بیٹھا جگن ناتھ۔ "

میں جگن ناتھ بن گیا ہوں۔ سکھی ہو گیا ہوں لیکن میرے ادھر ادھر کے کاٹھ ٹھنڈے نہیں۔ سلگ رہے ہیں۔ انہیں آگ لگی ہے۔ ادھر بھی سلگن ادھر بھی. سلگن، ٹھنڈی میٹھی سلگن نہیں، جھلس دینے والی پھر حیرت کی بات ہے کہ بیچ میں ٹھنڈک کیسے ہے لیکن ہے۔ ٹھنڈ ہے، سکون ہے، امن ہے۔ زندگی میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں۔

میں دو خواتین سے گھرا ہوا ہوں۔ ایک میرے ادھر ہے ایک ادھر. دونوں کی توجہ مجھ پر مرکوز ہے۔ دونوں مجھ پر جان چھڑکتی ہیں۔ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں۔ بیچ میں. میں جگن ناتھ بنا بیٹھا ہوں۔

وہ دونوں میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتی رہتی ہیں۔

ایک کہتی ہے "دیکھ مرد بن۔ دوجی کو اپنے جوتے تلے رکھ۔ "

دوجی کہتی ہے "مجھے پتہ ہے کہ وہ تیرے کان بھرتی رہتی ہے جو تو اس کی باتوں میں آ گیا تو کیا ہو گا۔ "

ایک کہتی ہے "تو نے سنا نہیں سیانے کہتے ہیں گربہ کشتن روز اول۔ یہ ہنس مکھیاں پہلے بھرماتی ہیں پھر چڑیل کی طرح سر چڑھ جاتی ہیں۔ "

دوجی کہتی ہے "توبہ اس کی زبان تو قینچی ہے کاٹنا جانتی ہے. جوڑنا نہیں جانتی۔ "

ایک آنسو چھلکاتی ہے "ہئے۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ اپنے ہاتھوں تجھے کانٹوں میں دھکا دے دیا۔ یہ تیرے لائق نہ تھی۔ "

دوجی کہتی ہے ”وہ ہمارے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہے۔ وہ مجھے بسنے نہ دے گی۔“

ایک کہتی ہے ”دیکھ تو دوجی کے بہن بھائیوں کو منہ نہ لگا۔ جو لگایا تو وہ گھر پر قبضہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ بیوی کو قابو میں رکھ۔“

بیوی کہتی ہے ”جو اس کا بس چلے تو تیری چارپائی اپنے ساتھ لگا کر بچھائے۔ کہتی ہے راشن کر کے دونگی میرا پتر ہے۔“

ماں نے بڑے چاؤ سے میری شادی کی تھی۔ اپنے چناؤ کی دلہن لائی تھی۔ مجھ سے کہا کرتی تھی۔ ”دیکھ رفیق تیرے لئے ایسی دلہن لاؤں گی کہ تو خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا۔ اس گھر کو چاند کی طرح منور کر دے گی۔ برادری والیاں دیکھ کر منہ میں انگلیاں ڈال کر بیٹھ جائیں گی۔ خالی حسن نہیں، سگھڑ، ہنس مکھ، خدمت گزار، تو دیکھنا تو سہی۔“

شادی سے کئی ماہ پہلے سے ہمارا گھر دلہن کے تذکرے سے بھرا رہا۔ دلہن کا حسن، دلہن کے خدوخال، دلہن کا گورا چٹا رنگ، ماں پورے چھ مہینے دلہن کے گن گاتی رہی تھی۔ لیکن شادی کے بعد ابھی دلہن کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ پھیکا نہ پڑا تھا کہ ماں کا رخ بدل گیا۔ وہ زرینہ سے کھلنے لگی۔

جہاں تک میرا تعلق تھا، میں دلہن کو دیکھ کر راضی تو ہوا تھا البتہ خوشی سے پھولے نہ سمانے والی بات نہ تھی۔ ناک نقشہ اچھا تھا۔ رنگ گورا تھا لیکن وہ تڑپ نہ تھی چمک نہ تھی جو آج کل کی لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ بات بات پر شرما جاتی۔ طبیعت میں جھجک تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ ”ہاں جی“ تھی۔ آج کل ”ہاں جی“ کو جون پسند کرتا ہے بھلا ساس کرے تو کرے میاں تو نہیں کرتا۔!“

زرینہ میں خوبیاں بھی تھیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔ میری باتیں غور سے سنتی۔ اثر سے بھیگ جاتی۔ مجھے یوں مناتی جیسے میں دیوتا تھا۔ پوجا کی آرتی کے پھول میرے چرنوں میں بھینٹ کرتی رہتی۔ شروع شروع میں ماں کے منہ سے زرینہ کے خلاف باتیں سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماں اس کے خلاف کیوں بھری بیٹھی ہے۔

ماں کی شکایتیں سن سن کر میرے کان پک گئے۔ الٹا میرے دل میں زرینہ کے لئے

ہمدردیاں پیدا ہو گئیں۔ پھر ماں کی باتوں پر دبا دبا غصہ آنے لگا۔ جو اندر اندر مجھے انڈے کی طرح پھینٹتا۔ مگر میں ماں سے کچھ نہ کہتا۔

صاحبو۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ماں کو مقدس دیوی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ جانتے ہیں کہ وہ عورت ہے اس میں رقابت ہے۔ جلاپا ہے۔ ملکیت جتانے کا جنون ہے۔ پھر بھی اسے مقدس مانتے ہیں۔

میں ماں کی باتیں سنتا رہا۔ سنتا رہا۔ وہ میرے دل میں چھید کرتی رہیں۔ کرتی رہیں۔ میں چھلنی بن کر رہ گیا۔ مجھے ڈیپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ زرینہ نے اپنے بے بس پتھر کے دیوتا کا یہ حال دیکھا تو نفرت سے پیچھے ہٹنے کی بجائے اس میں ممتا جاگ اٹھی۔ وہ اور قریب آ گئی۔ میرے تابوت میں یہ آخری کیل تھی۔

پھر اتفاقاً بھگت سے میری ملاقات ہو گئی۔ مجھے اسپکشن کے لئے سنگ والی فیکٹری میں جانا پڑا۔ سائیں بھگت سنگ والی کے مزدوروں کا پیر ہے۔ اونچا لمبا بارلیش کڑا۔ تیکھا، کسیلا اور بے نیاز۔

سنگ والی میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ بھگت ہندو ہے، مسلمان ہے کہ سکھ ہے۔ کبھی ماتھے پر تلک لگا لیتا، کبھی کیس باندھ لیتا، کبھی ہاتھ میں تسبیح اٹھائے پھرتا۔

جی میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو وہ ایک بے اولاد کو مشورہ دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا "بھائی جی! دعا کی بات بعد میں آئے گی۔ پہلے اپنی نیک بخت کی منجھی کے ساتھ اپنی منجھی جوڑو۔ بی بی کی محبت دل میں رچاؤ۔ پھر محنت مشقت کرو۔ پھر دعا کی باری آئے گی۔" اس کی حقیقت پسندانہ بات سن کر میں نے سوچا کہ اس کا مشورہ لوں۔

اس شام میں بھگت سے اکیلے میں ملا۔

"کیا مشکل ہے"؟ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "میں ماں اور بیوی کے پاٹوں تلے پس رہا ہوں۔"

وہ ہنسا۔ بولا "یہ تو گھر گھر کا رونا ہے بابو"

میں نے کہا۔ "میں کیا کروں کس کا ساتھ دوں۔ ماں کا یا بیوی کا"؟

"ساتھ دینے سے کچھ نہ ہو گا"۔ اس نے کہا "چاہے ماں کے کہنے سے گھر والی کو پیٹو۔ چاہے گھر والی کے کہنے پر ماں کو ڈانٹو۔ سب بے کار ہے بلکہ ایسا کیا تو چکی کے پاٹ

اور زور سے چلیں گے۔ اور مہین پسو گے۔ دیکھو بابو۔ وہ بہو، ساس نہیں، سوکنیں ہیں۔ ماں میں تجی ناری ہے۔ بیوی میں تجی ماں ہے۔ وہ بدل نہیں سکتیں۔ صرف ایک اپائے ہے۔ تم خود بدل جاؤ۔ جگن ناتھ بن جاؤ۔ نہ ماں کی بات پر کڑھو نہ گھر والی کی ہمدردی سے چھلکو۔ نہ اسکی سنو نہ اس کی سنو۔ ادھر کاٹھ ادھر کاٹھ بیچ میں بیٹھا جگن ناتھ۔"

جگن ناتھ بننا بہت مشکل تھا۔ خود کو کاٹھ بنالینا۔ نہ لاگ نہ لگاؤ۔ لیکن میں جگن ناتھ بن گیا۔ دکھ درد خوشی سب ختم ہوگئے۔ نہ لگن رہی نہ جلن رہی۔ نہ پیڑ رہی نہ چبھن رہی۔

گھر کے جھگڑے چلتے رہے۔ چکی کے پاٹ چلتے رہے۔ میں کوکڑو بن گیا جو نہ گلتا ہے نہ پستا ہے۔ دونوں طرف آنسوؤں کی جھڑیاں لگی رہیں لیکن میں سوکھا رہا۔

مجھ پر بھید کھل گیا کہ سکھ خوشی کا نام نہیں غم اور خوشی دونوں سے بے نیاز ہو جانے کا نام ہے۔ مجھے پتہ چل گیا کہ دنیا کو بدلنا خیال خام ہے۔ خود کو بدل لو۔ ذات کے حوالے سے نہیں. اللہ کی نظر سے گردو پیش کو دیکھو۔ نہ لاگ نہ لگاؤ۔ لاگ لگاؤ نہ رہیں تو حسن ہی حسن نظر آنے لگتا ہے۔ کانٹے میں بھی، پھول میں بھی۔

کاٹھ تو میں بن گیا۔ پورے چار سال اس جنت میں پڑا رہا لیکن اس کاٹھ میں ایک دراڑ پڑی رہی۔ لاکھ جتن کئے لیکن وہ دراڑ بند نہ ہوئی۔ میرے دل کی گہرائیوں میں یہ آرزو دبکی بیٹھی رہی کہ میری ماں اور بیوی دونوں آپس میں پیار کریں۔

پھر میرا تبادلہ لاہور ہیڈ آفس میں ہوگیا۔ ماں نے کہا۔ "دیکھو ہمیں یہاں چھوڑ کر خود لاہور نہیں جانا۔ سمجھے۔ چھٹی لے۔ لاہور جا۔ ہمارے لئے مکان تلاش کر۔ پھر ہمیں لے کر جا۔ اس کے بعد لاہور میں چارج لینا"۔

لاہور جانے والی بس حادثے کا شکار ہوگئی اور نیچے کھڈ میں جا گری۔ اتفاق سے میں کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ کھڈ میں گرنے سے پہلے ہی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا اور میں اچھل کر باہر جا گرا۔ پتہ نہیں وہاں کتنی دیر بے ہوش پڑا رہا۔ وہاں سے گاؤں کا حکیم اٹھا کر مجھے گھر لے گیا۔ مجھے زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ دس پندرہ دنوں میں ٹھیک ہوگیا۔

وہاں مجھے پتہ چلا کہ بس کے ۲۲ مسافر ہلاک ہو چکے تھے۔ اور مرنے والوں کی فہرست میں میرا نام بھی شامل تھا۔

حکیم صاحب نے کہا "دیکھ گھر والے تجھے روپیٹ چکے ہیں۔ اب تیرا اچانک گھر جانا مناسب نہیں۔ شادی مرگ کا خطرہ ہے۔ یہ خبر انہیں آہستہ آہستہ سنانی چاہئے تیرا کوئی راز داں دوست ہو جس کا گھر میں آنا جانا ہو۔ جا کر کہے کہ سننے میں آیا ہے کہ تو زندہ ہے۔ پھر وہ تیری ڈھونڈ کریں۔ اور آخر کار تو انہیں مل جائے۔"

حکیم صاحب کی رائے کے مطابق میں نے فیصلہ کیا کہ پنڈی جا کر اپنے دوست یوسف کو راز دان بناؤں۔ اس ڈر سے کہ کہیں پہچانا نہ جاؤں میں نے ایک نقلی داڑھی خریدی۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور پنڈی روانہ ہو گیا۔

یوسف کے گھر جانے سے پہلے میں نے سوچا کہ ایک نظر گھر والوں کو دیکھتا چلوں تو کیا حرج ہے۔ اس بھیس میں مجھے پہچاننا ممکن نہیں۔ سمجھیں گے کہ کوئی فقیر ہے۔ میں گھر کی طرف چل پڑا۔

میرا خیال تھا کہ میری موت کی خبر سن کر ماں نے سر پیٹ لیا ہو گا۔ زرینہ اور اس کے درمیان اب تو کوئی روک نہ تھی۔ وہ اس پر ظلم ڈھا رہی ہو گی۔ قصائن بن گئی ہو گی۔

گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ دونوں اندر صحن میں بیٹھی تھیں۔

میں نے حیرانی سے دیکھا۔

ماں نے زرینہ کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ زرینہ رو رہی تھی۔ ماں کہہ رہی تھی "پگلی کیوں روتی ہے۔ میں جو تیرے پاس ہوں۔ جب تک میرے دم میں دم ہے تجھے کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔"

میں حیران رہ گیا۔ ماں تو اس کی ماں بن چکی تھی۔ ساس نہ رہی تھی پھر جیسے میری نظروں کے سامنے بھگت آ کھڑا ہوا۔ بولا "بابو وہ دونوں تیرے زور پر کھڑی تھیں۔ تو وہ کلا ہے جس سے دونوں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ تیرے زعم پر کڑکتی گرجتی تھی یہ تیرے زور پر سے جا رہی تھی۔ جھگڑا وہ نہیں تھیں۔ جھگڑا تو تھا۔"

میں یوسف سے ملے بغیر پنڈی سے واپس چلا آیا۔

بوتل کا کاگ

وہ چہرا اسے ہانٹ کر رہا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے وہ چہرا اس کے سامنے معلق ہو جاتا۔ اس چہرے کی عجیب خصوصیت تھی۔ دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے کوئی عظیم واردات بیت گئی ہو۔ اور چہرے پر اپنے نقوش چھوڑ گئی ہو۔

وہ اپنے البم کھول کر بیٹھ جاتی۔ ان البموں میں دنیا کے بڑے مصوروں کے بنائے ہوئے چہرے تھے۔ شدت سے سوجے ہوئے چہرے، غصیلے چہرے، دہشت گردی سے اٹے ہوئے چہرے، نورانی چہرے، سفاک چہرے، پراسرار چہرے۔

وہ بار بار ان البموں کے صفحے الٹتی لیکن ان میں کوئی چہرا اس نوعیت کا نہ تھا۔ یہ چہرے فرد کی کسی نفسی کیفیت کا اظہار کرتے تھے لیکن وہ چہرا اس بات کا غماز تھا کہ اس پر کیا کچھ بیت گیا ہے۔

اس چہرے کی آنکھیں لال سرخ تھیں جیسے دو پیالیوں میں خون چھلک رہا ہو۔ اس کے باوجود آنکھوں کو دیکھ کر خوف طاری نہ ہوتا تھا۔ ان آنکھوں میں عجیب سی مستی تھی۔ بے نیاز مستی۔ صرف آنکھوں میں ہی نہیں چہرے کے بند بند میں مستی یوں رچی بسی ہوئی تھی جیسے گندھے آٹے میں پانی رچا بسا ہوتا ہے۔

البموں سے مایوس ہو کر وہ باہر لان میں جا بیٹھتی اور سڑک پر آتے جاتے چہروں کو دیکھنے لگتی۔ شہری چہرے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں۔ ذہانت، مصروفیت اور دکھاوے کی چمک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عورتوں کے چہرے میک اپ نے ڈھانپ رکھے ہوتے ہیں۔ افسروں کے چہروں پر ڈرائنگ رومیت کے پس منظر پر سٹیٹس کے احساس کا غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ متمول لوگوں کے چہرے تو بالکل ٹھپ ہوتے ہیں۔ ان پر افلوئینس کی پھٹکار پڑی ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے چہروں میں زندگی تو ہوتی ہے لیکن بے چینی اور سوداہٹ کی مدو جزر انہیں گرگٹ بنا دیتی ہے۔

سڑک سے مایوس ہو کر وہ مزدور پارک کی اس بینچ پر جا بیٹھتی جو تین فیکٹریوں کے

عین سامنے لگا ہوا تھا۔ فیکٹریوں میں چھٹی ہوتی تو سائیکلوں پر سوار چہروں کا اک ہجوم سامنے سے گزرتا۔ وہ چہرے اصلی تھے۔ ملفوف نہ تھے لیکن دقت یہ تھی کہ ہجوم چہرے کی انفرادیت مسخ کر دیتا ہے۔ چہرا ایک ایسا دروازہ ہے جو اکیلے میں کھلتا ہے۔ دو کیلے میں بند ہو جاتا ہے۔

اس کی خواہش تھی کہ دیہات میں جا کر چہروں کا مطالعہ کرے۔ شاید دیہات میں وہ چہرا مل جائے جس نے اسے اس شدت سے متاثر کیا تھا۔ لیکن دیہات میں جانے کا اسے کبھی موقعہ نہ ملا تھا۔

ایمی کی زندگی میں دو جنون تھے۔ ایک تو وہ سیماب ذہن تھی۔ بند بوتل میں طوفان چلتا تھا۔ یہ دور جدید کی بخشش تھی۔ دوسرے اسے چہروں کا خبط تھا۔ یہ درس و تدریس کی دین تھی۔

یونیورسٹی میں اس نے نفسیات میں ایم ایس سی کیا تھا۔ پرسینٹی سے متاثر ہوتی تھی۔ سمجھتی تھی کہ انسانی شخصیت عظیم تخلیق ہے۔ اور اسی وجہ سے اس نے پورٹریٹ پینٹنگ کو ہابی بنا لیا تھا۔ کہتے ہیں فیس از دی انڈکس آف مائنڈ۔ ایمی کو اس کہاوت سے اتفاق نہ تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ چہرے کو ذہن کی نسبت پرسینلٹی سے زیادہ تعلق ہے۔ اس لئے چہرے کو دیکھ کر پرسنیلٹی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور پرسنیلٹی کی عظمت اس بات میں ہے کہ وہ پیراڈاکس کا مجموعہ ہوتی ہے۔ تضاد ہی تضاد اور اس کے باوجود اکائی۔

ایمی کی دوسری لگن ایک حسرت تھی۔ اسے یہ شکایت تھی کہ زندگی میں کچھ ہوتا نہ تھا۔ صبح ہوتی، شام ہو جاتی پھر صبح ہوتی اور شام ہو جاتی مگر کچھ بھی نہ ہوتا۔ وہی روکھی پھیکی روٹین۔ یہ کرو، یہ نہ کرو۔ یوں کرو یوں نہ کرو والے تلقین شاہی ابا۔ وہی جذبات کے گاڑھے شیرے سے لت پت۔ بچوں سے چ چ اور میاں سے جی جی کرنے والی امی۔ صبح شام نمازیں پڑھنے والی میاں کے قدموں میں جنت ڈھونڈنے والی اور پیروں فقیروں کی درگاہوں پر حاضری دینے والی ماں سے بھلا کیا بات کی جا سکتی ہے۔

ایک چھوٹا بھائی تھا جو بریک ڈانس کا شیدائی تھا۔ سارا دن وی سی آر پر انگریزی گانے سنتا رہتا۔ سر کا اندھا۔ تال کا رسیا۔ سارا دن جسم کو تال پر جھلاتا رہتا۔ ”دھن دھن نا“ جرک کرتا ہوا آتا۔ ”تن تن نا“ بدن تھرکاتا ہوا چلا جاتا۔ جو ہر وقت جسم کا

چھنکنا چھنکاتے رہتے ہیں۔ ان سے کوئی بات ہو سکتی ہے کیا۔ اور چھوٹا بھائی تو ویسے بھی آؤٹ آف کونسچن ہوتا ہے۔

ایمی کی آرزو تھی کہ کچھ ہو جائے۔ خواہش شدید تھی لیکن کچھ کے بارے میں تخیل مبہم تھا۔ بس ہو جائے۔ کچھ بھی ہو، کیسا بھی ہو، ہو جائے۔ دن چڑھتا۔ غروب ہو جاتا۔ مینہ آتا چلا جاتا۔ یونہی سال بیت جاتا اور کچھ بھی نہ ہوتا۔

ان کا گھر، گھر نہیں تھا۔ ایک سمندر تھا جس میں دور دور چار جزیرے واقع تھے۔ ایک الماری تھی جس میں چار بند بوتلیں دھری ہوئی تھیں، ایک دوسرے سے بیگانہ۔ ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گھر تو ہانڈی کی مصداق ہوتا ہے۔ بوٹیاں، سبزی، مصالحے شوربہ، سب ایک ہی برتن میں ملے جلے ہوتے ہیں۔

ایمی کی کوئی سہیلی بھی نہ تھی۔ چار ایک بنا دیکھی تھیں۔ بیٹھ کر گھٹنوں کپڑا، میک اپ، ہیر سٹائل کی باتیں کون سنے۔ وہ تو سمجھتی ہیں کہ لڑکی کی زندگی میں ایک ہی واقعہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے___ بیاہ۔ ایمی کو بیاہ کا چاؤ نہ تھا۔ بیاہ تو مون شائن ہوتا ہے۔ چار دن کی چاندنی اور پھر عمر بھر کی بوریت۔ دراصل ایمی نائٹ رائڈر جیسی فلموں پر پلی تھی۔ وہ دھماکے کی خواہاں تھی۔ کوئی فٹ فٹ قسم کا دھماکہ۔ کوئی ڈزا، ڈزا۔ روم۔ !! اور پھر فضا میں اڑتے ہوئے ٹکڑے کوئی پستول والا ڈاکو جو اغوا کر کے بالوں سے گھسیٹتا ہوا غار میں لے جائے۔ کوئی ایسا واقعہ جو اسے انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دے۔

ایمی ایک بند بوتل تھی جس کے اندر ایک طوفان چل رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ باہر بھی ایک ایسا ہی طوفان چلے اور دونوں طوفان ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں۔

رومان سے اسے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو اک فیشنی پاس ٹائم ہوتا ہے۔ یونیورسٹی میں وہ رومان کے نمونے دیکھ چکی تھی۔ چار ایک لڑکوں نے اسے اڑونے کی کوشش کی تھی جیسے وہ کٹی ہوئی پتنگ ہو۔

ایک تو حامد تھا۔ کبوتر سی آنکھیں۔ دل پر ہاتھ، ہونٹوں پر آہ۔ جیب میں منتخب شعروں کی کاپی۔ وہ پیچھے پیچھے چلنے والا تھا۔ پورا ایک سال وہ اس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ جب بھی ایمی کو پتہ چلتا کہ وہ پیچھے پیچھے آ رہا ہے تو اسے غصہ آجاتا۔ یہ کیا حرکت ہے کہ پیچھے پیچھے چلو۔ سامنے کیوں نہیں آتا۔ رستہ کیوں نہیں روکتا۔

مرد تو وہ ہوتا ہے جس میں جھپٹ ہو۔ یہ تو نرا الف لف ہے۔ پل پل کیڑا۔ پھر وہ جلیل تھا۔ اس کی آنکھوں چھیڑ نہ تھی۔ بات بات پر ٹھاٹھا ہنستا۔ ہنستا تو آنکھوں سے پھوار اڑتی۔ ہر راہ چلتی کو چھیڑتا تھا۔ لیکن بڑے مہذب انداز میں۔ تہذیب سے بھیگی ہوئی چھیڑ بھی کیا چھیڑ ہوتی ہے بھلا۔ بھڑ کا ڈنک نکال دو تو باقی کیا رہ گیا۔ نری بھوں بھوں۔

پھر کچھ ڈرائنگ رومیئے تھے۔ سوٹ ٹائی۔ شوشائن۔ جٹ قمیص۔ سٹف کالر۔ ان کا رومان تخیلی تھا جو اپنے لباس اور برتاؤ کے دھیان میں ڈوبے ہوں۔ میں کیسے لگتا ہوں۔ میں کھوئے ہوئے ہوں۔ وہ دوجے کو کیسے توجہ دے سکتے ہیں بھلا۔

پھر وہ جاجا تھا کسی ماجھے کا بھائی ہو گا۔ بات کم شور زیادہ۔ بات بات پر قہقہہ۔ قہقہہ کم ٹھاٹھا زیادہ آوازیں کستا۔ چیختا چلاتا۔ نعرے لگاتا۔ سٹوڈنٹ کم لیڈر زیادہ۔ جلوسی انداز لیکن لڑکی کو دیکھ کر اس کا اپنا جلوس نکل جاتا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے۔ بری طرح سے لڑکی کانشس تھا۔ یونیورسٹی میں سبھی لڑکی کانشس تھے۔ کیا طلباء کیا پروفیسر۔ بات ایک ہی تھی۔ اظہار جدا جدا تھے۔ لڑکی آتی تو باادب باملاحظہ۔ ہوشیار ہو جاتے۔

ایلی چاہتی تھی کوئی ایسا ساتھی ملے جو لڑکی آگئی کی حس سے بے نیاز ہو۔ جو اسے اپنے جیسا انسان سمجھے۔ لڑے جھگڑے، گتھم گتھا ہو جائے اور احساس ہی نہ ہو کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔

یونیورسٹی کے دور میں اگرچہ کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ لیکن ارد گرد ایک ہنگامہ تو رہتا تھا۔ تحصیل علم کے بعد اب وہ گھر میں آ کر ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی۔

یا تو لان میں بیٹھ کر چہرے دیکھتی رہتی۔ اور یا آنکھیں بند کر کے کچھ ہونے کے خواب دیکھتی رہتی۔

ایک روز جب وہ آنکھیں بند کر کے کچھ ہو جانے کا خواب بیت رہی تھی تو پیچھے آہٹ ہوئی۔

وہ چونکی۔ مڑ کر دیکھا۔ ارے۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ اس کے روبرو آہنی پھاٹک سے باہر ایک چہرا معلق تھا۔ دو لال سرخ آنکھیں جیسے پیالوں میں خون چھلک رہا ہو۔ منہ سوجا ہوا۔ اس سوجن میں کرب تھا۔ کرب کا وہ مقام جہاں وہ مستی میں بدل جاتا

ہے۔ کرب اور مستی آپس میں یوں گندھے ہوئے تھے جیسے پانی آٹے میں گندھا ہوتا ہے۔

اس چہرے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس پر کوئی بہت بڑا واقعہ گزر گیا ہو۔ کوئی عظیم حادثہ جس نے شخصیت کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہو۔ کوئی ایسا ہی واقعہ جیسا ایمی چاہتی تھی کہ اس پر گزر جائے۔

اس چہرے کو دیکھ کر اس کا سارا وجود لرز گیا جیسے کسی نے چاٹی میں ڈال کر بلوہ دیا ہو۔ بوٹی بوٹی تھرکی پھرسن ہو گئی۔

چار ایک دن وہ مری ہوئی چوہیا کی طرح بستر پر پڑی رہی۔ رہ رہ کر وہ چہرا اس کے سامنے معلق ہو جاتا۔ اس کا بند بند لرز جاتا۔ وہ سوچ میں پڑ جاتی۔ پتہ نہیں اس پر کیا افتاد پڑی ہو گی جس نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ شیشے کا گلاس کرچی کرچی ہو گیا ہے مگر پھر بھی جوں کا توں جڑا ہوا ہے۔ ذرا سی ٹھوکر لگے تو ریزہ ریزہ ہو کر ڈھیر ہو جائے۔ پھر وہ چہرا اسے ہانٹ کرنے لگا

مسلسل دو مہینے ایمی اس چہرے کی ڈھونڈ میں سرگرداں رہی۔ سڑکوں پر، گلیوں میں، بازاروں میں۔ سینما کے ٹکٹ گھروں پر، نمائشوں میں، ثقافتی میلوں میں۔

ایک روز اچانک اسے خیال آیا کہ کسی سے پوچھ کر دیکھوں شاید اتا پتا مل جائے۔ اس نے چوکیدار کو بلایا۔ کہنے لگی خان۔ "کچھ دنوں کی بات ہے ایک فقیر آیا تھا جس کی آنکھیں لال سرخ تھیں، بوٹی کی طرح۔ تم نے دیکھا تھا اسے۔"

"ہاں بیگم صاحبہ! وہ بولا۔ "آپ اسے دیکھ کر ڈر گیا تھا نا۔"

"ہاں —— کون تھا وہ۔ ؟"

"وہ کوئی مست تھا۔ شاید کسی قلندر کا بالکا ہو۔"

"وہ پھر نہیں آیا کبھی۔"

"نہیں" چوکیدار نے کہا۔ یہ "بالکا لوک اک جگہ نہیں ٹکتا۔ گھومتا پھرتا رہتا ہے۔"

قلندر کا بالکا۔ یہ الفاظ ایمی کے لئے مفہوم سے خالی تھے۔

ایمی کی ماں کبھی کبھی پیروں فقیروں کی بات کیا کرتی تھی۔ گھر میں سب اسے ضعیف

الاعتقاد سمجھا کرتے تھے اور اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

جب ایمی نے ماں سے پوچھا امی قلندر کسے کہتے ہیں تو وہ چونکی۔ پھر خیال آیا شاید ایمی مذاق کر رہی ہے۔ اس نے ایمی کی طرف غور سے دیکھا۔ تو وہ سنجیدہ تھی۔

ماں نے کہا۔ مجھے نہیں پتہ قلندر کون ہوتا ہے۔ میں تو صرف سہون شریف کے قلندر کو جانتی ہوں۔ وہ بہت بڑے بزرگ تھے۔ میں تو ان کے عرس پر حاضری دیا کرتی ہوں۔

"قلندر کے بالکے بھی ہوتے ہیں کیا۔" ایمی نے پوچھا۔

"بالکل ہوتے ہیں۔" ماں نے جواب دیا۔ "جس پر قلندر کی خاص نظر پڑ جائے وہ اس کا بالکا بن جاتا ہے۔"

دو تین دنوں کے بعد ایمی نے ماں سے پوچھا۔ امی "! سہون شریف کا عرس کب ہو گا۔" تو وہ حیران رہ گئی۔ ! اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ تو ان باتوں کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ کیوں خیر تو ہے تو کیوں پوچھ رہی ہے۔

اب کی بار آپ سہون شریف جائیں تو میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ ماں ہکی بکی رہ گئی۔

جب وہ ماں کے ساتھ عرس پر سہون شریف گئی تو اتنا بڑا ہجوم دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے ارد گرد لاکھوں چہرے تھے۔ اصلی چہرے جیتے جاگتے چہرے۔ جذبے سے سرشار چہرے۔ دکھاوے سے بے نیاز، لگن سے بھیگے ہوئے۔

حیرت اس بات پر تھی کہ ان چہروں پر انفرادیت کے نشانات بے حد مدھم تھے۔ لگن میں اس قدر سرشار تھے کہ میں کی لکیریں مدھم پڑ چکی تھیں۔ ایمی نے کبھی لگن سے سرشار چہرے نہ دیکھے تھے۔ وہ نفسیات کی طالبہ تھی۔ سمجھتی تھی کہ چہرے پر شخصیت کے نشانات ابھر آتے ہیں۔ چہرے کے خدوخال اور سلوٹوں میں "میں" کے نقوش ہویدا ہوتے ہیں۔ زائرین کے چہروں کی لگن کی بھڑاس نکل رہی تھی۔ چاروں طرف سے عقیدت کی پھوار پڑ رہی تھی۔ "میں" کے نقوش کو "تو" کی لگن نے ڈھانپ رکھا تھا۔ لاکھوں آدمی ایک جذبے سے سرشار تھے۔ جذبے کی شدت دیوانگی کا عالم برپا کئے جا رہی تھی۔ سارا مجمع شرابور ہوا جا رہا تھا۔

فرد کے اوپر رکھ رکھاؤ کا خول اتر چکا تھا۔ ہر کوئی سپردگی اور حوالگی سے جھوم رہا تھا۔ تمام تر توجہ ایک فرد واحد پر مرکوز تھی۔ خیال اور جذبے میں ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ مگر ایسے ہوتا ہے۔ جب لاکھوں افراد ایک ہی جذبے سے سرشار ہوں تو ایک مقناطیسی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور انبوہ کو جھٹکے لگتے ہیں۔

مزار کے اندرونی احاطے میں بیٹھے ہوئے ایلی کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس کے اندر سے جذبے کے بھبھاکے اٹھ رہے تھے۔ بوتل میں اک طوفان مچا ہوا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن سے قلندر کا بالکا بالکل نکل چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ خود قلندر کا بالکا ہو اور قلندر کی خصوصی نظر اس کا گھیراؤ کئے ہوئے ہو۔

دل دھک دھک کر رہا تھا۔ سانس لینا دشوار ہوا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی عظیم واقعہ۔

دفعتہً دف پر ضرب پڑی۔ اس کے سارے وجود میں اک گونج تھرائی۔ بوتل کا کاگ اک زناٹے سے اڑا۔ چھلانگ مار کر وہ بھیڑ سے باہر نکلی اور دفوں کے قریب اپنے بالوں کو جھٹکے سے کھول کر حال کھیلنے لگی۔

میاں

پتہ نہیں اس روز میاں پر بات کیسے چل نکلی۔ ورنہ عورتیں مل بیٹھیں تو میاں پر بات نہیں کرتیں۔ باتوں باتوں میں کوئی اپنے میاں کی نندا کر دے تو اور بات ہے۔ اور کوئی جب بھی کرے گی، نندا ہی کرے گی۔ میاں کے ساتھ بیتے ہوئے میٹھے لمحوں کا ذکر کوئی نہیں کرتی۔

"مجھے یاد نہیں کس نے بات چھیڑی تھی"۔ عطیہ جواب میں بولی۔ "میاں بھی اللہ نے کیا شے بنائی ہے"۔ بات میں حیرت کم تھی تمسخر زیادہ۔

اس پر سلمٰی بولی۔ "دس سال ہو گئے ہیں۔ اکٹھے رہتے ہوئے پر میں نے آج تک اپنے میاں کا بھید نہیں پایا"۔

"کس نے پایا ہے"۔ انجم نے زیر لب کہا۔

سلمٰی ہنسی۔ "میرا میاں تو اخروٹ کی طرح ہے۔ کاغذی نہیں، جنگلی اخروٹ۔ سخت، چھلکا ہی چھلکا جو توڑنے سے نہیں ٹوٹتا۔ لیکن کسی وقت بلا وجہ آپ ہی آپ ٹوٹتا ہے اور پھر نرم میٹھی گری"۔

اس پر گویا ساری کلیاں چٹک گئیں۔

عطیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس مخلوق کا بھی جواب نہیں۔ ہر دانے کا اپنا ہی سواد ہوتا ہے۔ ایک سے دوسرا نہیں ملتا۔ اللہ نے اپنے رنگ میں بنایا ہے۔ وحدہ لاشریک"۔

سنبل گھبرا کر بولی۔ "ہئے۔ میرے میاں تو اتنے اچھے ہیں، اتنے اچھے کہ کیا بتاؤں"۔

سلمٰی نے کہا۔ "سنبل تیری بات اور ہے۔ شادی کو ابھی چھ مہینے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی میاں نہیں بنا۔ ابھی تو وہ محبت کے چولہے پر چڑھا ہوا ہو گا۔ یہ دیگ تو دو ایک سال کے بعد تیار ہوتی ہے"۔

میں قہقہہ مار کہ ہنسی تو عطیہ بولی، "موی تیرا میاں تو پہلے روز سے ہی ریڈی میڈ میاں تھا۔ ابھی تو جھا چوہا ہے۔ منہ پر اتنے نوکیلے کانٹے ہیں کہ دور سے ہی چبھتے ہیں"۔

میں نے جواب دیا۔ "بالکل ہیں پر دور سے ہی چبھتے ہیں۔ پاس جاؤ تو پتہ چلتا ہے کہ گوند سے لگائے ہوئے ہیں۔ اصلی نہیں"۔

"میں نہیں مانتی" عطیہ نے کہا۔ پھر انجم سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تو نہیں بولتی انجم"؟

انجی مسکرا دی۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔

"یہ نہیں بولیں گی" سنبل نے کہا، "انہیں تو چپ لگی ہے"۔

"پتہ نہیں اس چپ کے نیچے کتنے بڑے بم کا گولا چھپائے بیٹھی ہے"۔ عطیہ نے کہا۔

"اس کی بات کا تو چرچا گھر گھر ہوتا رہا تھا مہینوں"۔ سلمیٰ بولی۔ "اور کیوں نہ ہوتا۔ بات ہی ایسی تھی"۔

"ہاں بالکل"۔ عطیہ سنجیدہ ہو گئی۔ "جب ماں باپ زبردستی اسے اونٹ کے گلے میں باندھنے لگے تھے تو اس ٹلی نے اس قدر ٹن ٹن کیا تھا کہ سارے محلے میں آواز گونجی تھی"۔

"ہاں" میں نے کہا۔ "سبھی کہتے تھے کہ یہ ناؤ جو اس قدر ڈول رہی ہے کنارے نہیں لگے گی"۔

"اور جب کنارے لگ گئی"۔ عطیہ نے کہا۔ "تو کہنے لگے نبھے گی نہیں"۔

"ہاں سبھی کہتے تھے چھینٹے اڑیں گے"۔ سنبل مدھم آواز میں بولی۔

"ہئے"۔ سلمیٰ نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "پھر ایسی نبھی، ایسی نبھی کہ سبحان اللہ۔ دنیا حیران رہ گئی"۔

"کہتے تھے مثالی جوڑی ہے"۔ سنبل بولی۔

"ہاں" میں نے کہا۔ "لوگ کہتے تھے کہ انجم نے گھر نہیں جنت بسائی ہے"۔

"پھر پتہ نہیں اس جنت میں کون شیطان آگھسا"۔ عطیہ نے ہاتھ چلا کر کہا۔ کہ دفعتاً میاں نے طلاق بھیج دی۔ اور اس اللہ کی بندی نے بھی بھید نہیں کھولا آج تک"۔

"دیکھو تو مسکرا رہی ہے پر منہ سے نہیں بولتی"۔ سلمٰی نے انجم کی طرف اشارہ کیا۔

"اتنا ہی بتا دے کہ ہوا کیا"۔ عطیہ بولی۔

"پتہ ہو تو بتاؤں"۔ انجم کی مدھم آواز آئی۔

"خود ہی تو کہہ رہی تھی کہ میاں کا بھید کسی نے نہیں پایا"۔ انجم بولی۔

"کیوں موی تجھے تو پتہ ہو گا" سلمٰی نے کہا۔ "تم دونوں تو جانی تھیں ایک دوجے کی"۔

"وہ تو ہیں"۔ میں نے کہا۔ پر میاں کے بھید کون کسی سے کھولتی ہے"۔

اس پر سب قہقہہ مار کہ ہنس پڑیں۔

سلمٰی سچ کہتی تھی۔ انجم اور میں جانی سہیلیاں تھیں۔ کالج میں اکٹھی پڑھا کرتی تھیں۔ ان دنوں میں اسے انجی کہہ کر بلایا کرتی تھی، کالج میں وہ اتنی تیکھی تھی کہ میڈموں کو چبھتی تھی۔ وہ اسے چڑ کر انجن کہا کرتی تھیں۔ آرام سے بیٹھنا نصیب نہ تھا۔ اندر مدھانی چلتی رہتی تھی۔ ہر وقت سوڈے کی بوتل کی طرح بلبلے ہی بلبلے، ابھی گراونڈ میں جاگنگ کر رہی ہے۔ پھر جو دیکھا تو درخت کی ٹہنی سے لٹکی جھول رہی ہے۔ کلاس میں بیٹھی بیٹھی سیٹی مار دیتی۔ میڈم کہتی، انجن چلنے کو ہے کیا؟ فٹ اٹھ کر کہتی میڈم انجن میں تو کوئلہ ہی نہیں ہے۔ میڈم کہتی یہ انجن کوئلے کے بغیر چلتا ہے۔

شرارتوں میں سب سے پہلے۔ پڑھائی میں فسٹ ڈیوژنر، ڈیبیٹ میں اول رہتی، ڈرامہ ہوتا تو میل پارٹ انجی کو دیتے۔ انجی میں جھجھک قطعی طور پر نہ تھی۔ بات کرتے ہوئے نہ ڈرتی تھی نہ شرماتی تھی، نہ بنتی سنورتی تھی، نہ نخرہ کرتی تھی، رومان پسند نہ تھی۔

دو تین لڑکے اس کی جانب بری طرح سے مائل تھے لیکن انجی نے انہیں کبھی منہ نہ لگایا تھا۔ جب ہم چھٹی کے وقت گھر آتیں تو ایک لڑکا کالج کے دروازے پر اس کے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ اس کا نام کامران تھا۔ خوش شکل تھا اور بہت دلیر تھا۔ غالباً کسی

بڑے افسر کا بیٹا تھا۔ ذرا نہ جھجکتا   ہیلو انجی وہ مسکراتا۔

ہیلو   انجی، کامران کی طرف دیکھے بغیر جواب دیتی۔

آؤ میں تمہیں موٹر سائیکل پر گھر چھوڑ آؤں۔ بیٹھ جاؤ۔ دونوں ہی ۔ وہ کہتا۔

"ہمیں پیدل چلنے سے دلچسپی ہے"۔ وہ بے نیازی سے کہتی۔

"وقت بچ جائے گا"۔ کامران کہتا۔

وہ رک جاتی بھرپور نگاہ سے کامران کی طرف دیکھتی۔ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ کسی پھل دار ٹہنی کو جھلاؤ مسٹر کہ انگور گریں۔ کیکر سے کچھ نہیں گرے گا۔ یہ کہہ کر۔ . . . . وہ چل پڑتی۔

پیچھے سے آواز آتی۔ ہمیں تو کیکر پسند ہیں۔

بی اے کے امتحان کے بعد ایک روز میں ان کے گھر گئی تو اس کی ممی انجم کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔ میں نے پوچھا کیوں آنٹی انجم کی شادی کر رہی ہیں آپ۔

وہ بولیں ہاں! اگلے مہینے۔ انجم کے ڈیڈی نے فیصلہ کر دیا ہے۔

ان کے گھر میں انجی کے ڈیڈی کا فیصلہ پتھر کی لکیر ہو جاتا تھا۔ کسی کی جرات نہ تھی کہ ان سے کیوں. کس لئے پوچھے۔ وہ دو اور دو چار قسم کے باپ تھے۔ ریٹائرڈ آرمی افسر تھے۔ شاید اس لئے۔

ایک روز انجی مجھ سے ملی۔ بجھی بجھی تھی۔ میں نے کہا کیا ہوا۔

کہنے لگی۔ ڈیڈی سے بات ہوئی۔ میں نے کہا "ڈیڈی میں شادی نہیں کروں گی"۔

بولے۔ "شادی کرے گی اور احسن ہی سے کرے گی۔ ہم نے تیرے لئے بہت موزوں رشتہ تلاش کیا ہے"۔

میں نے کہا "ڈیڈی آپ مجھے مجبور کریں گے تو میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی"۔

انہوں نے کہا "دیکھو انجم۔ تو میری بیٹی ہے۔ اور میں تیری پور پور سے واقف ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ تو گھر چھوڑ کر نہیں جائے گی"۔

انجی کی باتیں سن کر میں تو ڈر گئی۔

مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ انجم کے ڈیڈی نے احسن سے شادی کیوں طے کی تھی۔ میں نے احسن کو دو ایک بار ان کے گھر میں دیکھا تھا. وہ افسر تھا. امیر گھرانے سے تھا. کلچرڈ تھا. مدھم طبیعت کا مالک تھا. پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی. عمر میں پندرہ سال بڑا تھا. اور بالکل بائیٹش نہیں تھا. پتہ نہیں اس کے ڈیڈی نے انجم کے لئے احسن کو کیوں چنا تھا۔

انجی کہنے لگی۔ مومی کسی طرح سے کامران کا پتہ لگاؤ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔

کامران کا پتہ مجھے آسانی سے لگ گیا۔ اس کی ایک کزن کالج میں پڑھتی تھی نا۔ پتہ چلا کہ کامران کے باپ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ اور وہ باپ کو لے کر لندن گیا ہوا ہے۔ جب انجی کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ بالکل ہی بجھ گئی۔

انہیں دنوں میرے ابا کا تبادلہ ہو گیا اور ہم کراچی چلے گئے۔ وہاں میں نے سنا کہ انجی کی شادی احسن سے ہو گئی ہے۔ میری شادی بھی ہو گئی اور ہم دونوں ایک دوسری سے بالکل کٹ گئیں۔

دس سال کے بعد میرے میاں کا تبادلہ پنڈی ہو گیا۔ یہاں آئی تو پتہ چلا کہ طلاق ہو چکی ہے۔ اور وہ سکول میں پڑھاتی ہے۔ انجی سے ملی تو حیران رہ گئی۔ اب انجم وہ انجی نہ تھی۔ نہ وہ تیزی نہ شوخی جیسے آگ پانی میں بدل چکی ہو۔ یہ تبدیلی دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی۔ میں نے کئی بار انجی سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا۔ وہ مسکرا کر کہتی مومی "ہونی" تھی ہو گئی۔

اب ہم اکثر ملا کرتی ہیں۔ ہمارے بچے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ دو بچے انجی کے ہیں۔ دو میرے۔ میرے میاں بھی انجی کے بڑے مداح ہیں۔ بڑا اچھا وقت کٹ رہا ہے۔

دو چار دن کی بات ہے میں نے انجم سے کہا چلو بچوں کو مری لے چلیں۔ دو دن وہاں پک نک کریں گے۔ وہ مان گئی۔ میرے میاں نے سارا انتظام کر دیا لیکن خود ساتھ نہ جا سکے۔

ایک رات مری میں جب ہم دونوں جاگ رہی تھیں. بچے سوئے ہوئے تھے۔ موسم بڑا خوش گوار تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ انجم بڑی خوش خوش نظر آ رہی تھی۔ آپ ہی آپ

بولی۔ مومی۔ احسن اور میں کئی بار یہاں آئے تھے۔ اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا کرتے تھے۔

پہلی مرتبہ اس نے مجھ سے احسن کی بات کی تھی۔ مجھے موقعہ مل گیا۔ میں نے پوچھا۔ انجی احسن کیسا آدمی تھا؟

وہ خواب آلود لہجے میں بولی۔ وہ خس کی طرح تھا۔ مومی۔ خشبو ہی خشبو. مدھم خشبو۔ جتنا پیار مجھے احسن نے دیا ہے کسی اور نے نہیں دیا تھا۔ میں یہ سن کر حیران رہ گئی. پر تو تو اس سے بیاہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔

نہیں چاہتی تھی۔ وہ بولی۔ احسن کو بھی پتہ تھا کہ میں نہیں چاہتی پر اس نے یہ بات کبھی نہ جتائی تھی۔ کبھی نہیں۔ اس نے مجھ پر کبھی کوئی پابندی نہ لگائی تھی۔ مجھے یوں رکھا جیسے گلدان میں پھول سجاتے ہیں۔ مومی۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا تھا کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ وہ رک گئی پھر آپ ہی بولی

گھر میں ہم تین تھے۔ احسن، اس کی ماں اور میں۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ماں ساس بن کر حکم نہ چلائے۔ اس لئے اس نے ماں کے لئے ایک علیحدہ نوکرانی رکھ لی تھی۔ ماں بہت بوڑھی تھی زیادہ چل پھر نہ سکتی تھی۔ احسن نے ماں کو مین گھر سے ہٹ کر ایک کمرا دے رکھا تھا۔

"کیسے مزاج کی تھی وہ"۔ میں نے پوچھا۔

"جلی کٹی ہوئی بڑھیا۔ مجھے یوں دیکھتی تھی جیسے قصائی بکرے کی طرف دیکھتا ہے۔ میرا خیال ہے احسن نے ماں سے کہہ رکھا تھا کہ انجی کو رہنے دو جیسے وہ رہتی ہے۔ مخل نہ ہونا"۔

"پھر وہ کیا بات ہوئی کہ اس نے آٹھ سال کے بعد طلاق دے دی"۔

"کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی"۔ وہ بولی۔

"آخر کوئی وجہ تو ہوگی"۔

"مجھے نہیں پتہ" اس نے جواب دیا۔ "تیری قسم"۔

"اچھا یہ بتا کامران ملا تھا تجھے"؟ میں نے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولی۔ "ملا تھا۔"

"کب"؟

شادی سے ایک مہینے بعد اف. اس نے ایک لمبی سانس لی. اس روز میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ وہ رک گئی۔

پھر بولی۔ اس روز احسن دورے پر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں ماں اور میں اکیلے تھے۔ شام کے آٹھ بجے تھے۔ میں سٹڈی میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ کھڑکی سے ٹارچ کی لائٹ مجھ پر پڑی. اٹھ کر دیکھا. باہر کامران کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ مجھے آپ سے ضروری بات کہنی ہے۔ میں نے کھڑکی کھولی۔ وہ پوچھے بغیر کھڑکی پھلانگ کر اندر آ گیا۔ کہنے لگا۔ آپ نے مجھے بلایا تھا کیا۔

ہاں بلایا تھا۔ میں نے کہا لیکن آپ بہت دیر کے بعد آئے۔

پھر وہ اپنے ڈیڈی کے ہارٹ اٹیک کا قصہ سناتا رہا۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے قصے چل پڑے۔ باتوں ہی باتوں میں دس بج گئے اور مجھے پتہ ہی نہ چلا۔

پھر دفعتاً اندر کا دروازہ بجا۔ کون ہے میں نے پوچھا۔

دروازہ کھولا. ماں کی غصے بھری آواز آئی۔

آواز سن کر میں گھبرا گئی۔ پتہ نہیں یہ بڑھیا کیا فساد مچائے۔ اس قدر گھبرا گئی میں اس وقت کہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر بیٹھی۔کمرے میں ایک قد آدم الماری کھڑی تھی۔ میں نے کامران کو الماری میں چھپا دیا۔

دروازہ کھولا تو بڑھیا بڑے غیض و غضب میں تھی۔ آتے ہی اس نے کمرے کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ پھر با آواز بلند بولی۔ یہیں ہو گا کہیں۔ میں نے خود اسے کھڑکی سے اندر آتے دیکھا تھا۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا. کہ وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی۔ مڑ کر دیکھا. دروازے میں احسن کھڑے تھے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

ضرور اس الماری میں چھپا ہو گا. بڑھیا چلائی۔

میں دیکھتا ہوں. احسن آگے بڑھے۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یا اللہ تو ہی میری عزت رکھنے والا ہے۔ ایک طویل خاموشی چھائی رہی۔ میں یوں محسوس کر رہی تھی کہ کچہری میں کھڑی جج کے فیصلے کا انتظار کر

رہی تھی۔

توبہ ہے. میں جذبات کی شدت سے چلائی لیکن حلق میں آواز نہ تھی۔ دیر تک انجی چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر چونک کر بولی۔

احسن کہہ رہے تھے یہاں تو کوئی نہیں ہے، اماں تیرا وہم تھا۔

اس پر بڑھیا غصے میں غرائی۔

لیکن احسن نے مجھ سے کہا انجم، مجھے کافی کا ایک پیالہ بنا دو میں بہت تھک گیا ہوں. یہ کہہ کر وہ ہم دونوں کو ڈائننگ روم میں لے گئے۔

لیکن، لیکن میں نے پوچھا. کیا کامران تیرے میاں کو نظر آیا تھا یا

مجھے نہیں پتہ وہ بولی، اس واقعہ کے بعد میں کئی دن سن ہوئی رہی۔ لیکن احسن کا رویہ ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بس احسن کی اس بات نے مجھے دل و جان سے اس کی باندی بنا دیا۔ اس کے بعد آٹھ سال احسن اور میں نے اکھٹے گزارے۔ پھر احسن نے کبھی وہ بات نہ جتائی

بالکل نہیں۔ کبھی اشارۃً ''بھی اس کا ذکر نہیں کیا. وہ بولی. یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

تو پھر احسن نے کامران کو نہیں دیکھا ہو گا۔ میں نے کہا۔

ہاں وہ بولی۔ میں بھی یہی سمجھتی رہی۔

مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

غالباً اس نے میری بات نہ سنی. وہ خواب آلود انداز سے کہنے لگی۔ موی۔ تجھے پتہ نہیں، میری زندگی میں ایک عجیب بات ہے۔ پر اسرار طاقت جب کبھی میں بھرپور توجہ کروں۔ پورے تن من سے ''دل'' کروں تو وہ بات پوری ہو جاتی ہے۔ بچپن ہی سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ ایک بار امی نے مجھے مارا تھا۔ میرے دل میں شدت سے آئی. اللہ کرے تیری بانہہ ٹوٹ جائے۔ اسی روز اماں گر پڑی اور اس کی بانہہ کا فریکچر ہو گیا۔ اسی طرح ایک روز میں نے ہوم ورک نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا۔ اللہ کرے مس بیمار پڑ جائے۔ اور سکول میں نہ آئے۔ اس روز مس سکول میں نہ آئی تھی۔

اسی طرح کے واقعات میری زندگی میں عام ہوتے رہے ہیں۔ امی کہا کرتی تھی انجو

کی زبان کالی ہے جو کہتی ہے وہ ہو جاتا ہے۔

اس روز جب احسن نے الماری کھولی تھی۔ میں نے پورے تن من سے دل میں کہا تھا یااللہ میری عزت رکھنا۔ انجی رک گئی۔ انجی کی بات سن کر میں بھی سوچ میں پڑ گئی۔ ہم دونوں پتہ نہیں کتنی دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ پھر انجی نے خود ہی بات شروع کی۔ کہنے لگی۔ کئی بار مجھے خیال آتا کہ شاید کامران احسن کو نظر نہ آیا ہو۔ اس پر میرا ضمیر مجھے جھنجھوڑتا کہ تو نے احسن سے دھوکا کیا ہے۔ کئی بار میں نے چاہا کہ احسن کو ساری بات بتا دوں۔ لیکن مجھ میں حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ اسی کشمکش میں آٹھ سال گزر گئے۔ یہ آٹھ سال میری زندگی کا سرمایہ ہیں موی۔ آٹھ سال میں احسن کی توجہ اور محبت میں یوں بھیگی رہی جیسے رس ملائی دودھ میں ڈوبی رہتی ہے۔

پھر ایک دن جب احسن دورے پر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں نے انہیں بٹھالیا۔ زبردستی اور ساری بات ان سے کہ دی۔

پر کیوں ۔ خواہ مخواہ۔

پتہ نہیں کیوں۔ بس دل میں آئی کہ کہہ دو. میں نے کہ دی۔ وہ چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے۔ یوں سنتے رہے جیسے کوئی نئی بات نہ ہو جیسے وہ جانتے ہوں. منہ سے کچھ نہ بولے۔

پھر میں نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ ہماری آخری بات تھی موی۔ انجی نے آہ بھر کہ کہا۔ میری بات سن کر جواب دیئے بغیر وہ اٹھ کر دورے پر چلے گئے اور چار دن کے بعد مجھے ایک رجسٹری موصول ہوئی. کھولا تو اندر طلاق نامہ تھا۔

بوند بوند بیتی

اس روز صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ کئی بار کھل جاتی ہے۔ لیکن پھر سے بند کر کے پڑ رہتا ہوں۔ پھر آنکھ لگ جاتی ہے۔ اس روز کھلی تو غیراز معمولی کھلی ہی رہی۔ بند کرنے کی بہت کوشش کی۔ نہ ہوئی۔ مجبوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بتی جلائی۔

دفعتاً میری نگاہ نینی پر پڑی۔ ٹھٹھکا۔ بیٹھا حیران دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ نینی کی دونوں آنکھوں میں بوندیاں لٹک رہی تھیں۔

نینی شیشے کا ایک کھڑا پیپر ویٹ ہے۔ جو پچیس سال سے میرے پاس ہے۔ شیشے کے اس گولے کی ایک طرف وہ آنکھیں بنی ہوئی ہیں۔ آنکھوں کی تصویر نہیں۔ آنکھیں۔ ابھری ہوئی آنکھیں۔ مژگان کی پنکھیاں نکلی ہوئی بھویں تنی ہوئی۔ تین سنی آنکھیں۔ دکھنے والی نہیں دیکھنے والی آنکھیں۔ اندر کھب جانے والی نظریں۔

اس سے پہلے بارہا اس بات پر بیوی سے جھگڑا ہوا تھا۔ بھڑک کر نہیں۔ دبا دبا جھگڑا۔

بیوی نے کئی بار مجھ سے شکایت کی تھی۔ کہنے لگی۔ شیشے کے اس گولے سے پانی کیوں رستا ہے جس کاغذ پر رکھو گیلا ہو جاتا ہے۔ میں نے اس کی بات ہنس کر ٹال دی تھی۔ شیشے کے گولے میں بھلا پانی کیسے آیا۔ اندر ہو بھی تو رسے گا کیسے۔

وہ بولی۔ تم نہیں سمجھتے۔ اس گولے میں کہیں نا کہیں ضرور پانی ہے اور وہ آنکھوں سے رستا ہے۔ ٹپکتا ہے۔ بوند بوند۔

میری بیوی سمجھتی ہے۔ میں بالکل نہیں سمجھتا۔

ان سمجھ ہوں۔ اس لئے وہ اکثر کہا کرتی ہے۔ تو نہیں سمجھتا۔

ہم دونوں میں رواداری کا بندھن ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ نہیں سمجھتی۔ میری بات سن کر وہ درپردہ ہنس دیتی ہے۔ "ہٹاؤ یہ نہیں سمجھے

گا۔ ‘‘ اس کی بات سن کر میں دل ہی دل میں کہتا ہوں۔ اسے کون سمجھائے۔ لہٰذا ہم جھگڑا نہیں کرتے۔ بحث نہیں کرتے۔ در گزر کرتے ہیں۔ بڑے دکھ اور جبر سے ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔

میر بیوی نے دو چار مرتبہ مجھ سے یہی بات دہرائی تھی۔ ایک مرتبہ تو وہ کاغذ بھی دکھایا تھا جس پر نینی پڑا تھا۔ کاغذ گیلا تھا۔

کاغذ کو دیکھ کر میں کیا کہتا بھلا۔ بیوی کو سمجھانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ جان چھڑانے کے لئے میں نے جواب دیا تھا۔ ہاں ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ کاغذ بے شک گیلا ہے۔ شاید واقعی نینی سے پانی رستا ہو۔

دو ایک برس کے بعد وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی تھی۔ میری بانہہ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی مجھے کمرے میں لے گئی تھی۔ لو خود دیکھ لو۔ نینی کی آنکھوں سے بوندیں ٹپک رہی ہیں۔

میں نے دیکھا۔ واقعی نینی پر نم تھا۔

پہلے تو میں ٹھٹھکا۔ ذہن لڑکھڑایا۔ پھر سنبھل گیا۔ تاویلیں سوچنے لگا۔ جیسے ان ہونے والے حقائق کو ہوتے دیکھ کر دانشور کیا کرتے ہیں۔

بھائی صاحب! میں ایک پڑھا لکھا دانشور ہوں۔ چاہے اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ اپنے کانوں سے سنوں۔ مگر میں مانوں گا نہیں۔ جب تک بات میری سمجھ میں نہ آئے۔ اسے کیسے مان لوں۔ مشاہدے پر مجھے بھروسہ نہیں۔ حواس بے اعتبارے ہیں۔ صرف عقل۔

میں نے سوچ دوڑائی۔ تاویلوں کے تنکوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ممکن ہے بیوی نے انجانے میں نینی کو گیلے ہاتھ لگائے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے ڈراپر سے دو بوندیں نینی کی آنکھوں میں ٹپکا دی ہوں۔

میری بیوی نینی کی طرف اشارہ کر کے فاتحانہ انداز میں کہہ رہی تھی اب بولو۔

میں نے بن مانے ہینڈز اپ کر دیئے۔

صاحبو! اگر مجھ سے پڑھے لکھے دانشور شیشے کی آنکھوں کو آنسو. بہاتے ہوئے دیکھ

کر اسے مان لیں تو علم و دانش کے ہاتھ کیا رہ جائے گا؟

خیر — یہ تو پرانی تفصیلات ہیں۔

اس روز منہ اندھیرے میں نے اپنی آنکھوں سے نینی کو روتے ہوئے دیکھا تو سخت گھبرا گیا۔ پسینہ آگیا۔ آپٹکل الوژن کا سہارا لینے کی سوچ رہا تھا کہ ٹپ کی آواز آئی۔ بوند گر کر ٹیبل کلاتھ پر پھیل گئی۔ ہاتھ لگایا۔ کپڑا گیلا تھا۔ نینی کی دوسری آنکھ میں بوند ابھی لٹکی ہوئی تھی۔ مگر مجھ میں جرات نہ پڑی کہ ہاتھ بڑھا کہ اسے محسوس کروں۔ اگر واقعی بوند ہوئی تو میں کیا کروں گا۔

نینی ایک تحفہ تھا جو مجھے بھیجا گیا تھا۔ پتہ نہیں کس نے بھیجا تھا۔

پچیس سال پہلے۔ ڈاک سے میرے نام ایک پارسل آیا تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ نینی برآمد ہوا۔ ساتھ ایک پرچی بندھی تھی۔ لکھا تھا۔ "ایک امانت تحفہ۔ نینی" اور بس! امانت تحفہ سے کیا مطلب؟ بہت سوچا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ پتہ لگاؤں کہ بھیجنے والا کون تھا۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

پھر دفعتاً مجھے یاد آیا۔ ارے وہ دو آنکھیں اندھیرے میں روشن آنکھیں دکھنے والی نہیں دیکھنے والی آنکھیں۔

نینی موصول کرنے سے پندرہ بیس روز پہلے ایک شام میں تفریحی پارک میں بیٹھا تھا تھکا ہارا۔ کھویا کھویا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب میں زندگی کا میلا دیکھ کر واپس گھر آ چکا تھا۔ گھمسان کا رن بیت چکا تھا۔ تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ مورچھل کروا چکا تھا اور بالآخر معزول ہو چکا تھا۔ انتہائی تذلیل سے گذر چکا تھا۔ اور اب چلے ہوئے کارتوس کی طرح مٹی میں رلا ہوا تھا۔ تھکا ہارا۔ کھویا کھویا۔ یہاں تک کہ بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے کی آرزو سے بھی محروم ہو چکا تھا۔

اچانک ایک بوڑھی خاتون میرے روبرو آ کھڑی ہوئی بولی "آپ ممتاز مفتی ہیں۔"

"جی" میں چونکا، جاگا، سنبھلا۔

بولی۔ "آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"کون بلا رہے ہیں؟"

کہتے ہیں اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو فوارے کے پاس تشریف لائیں۔"

ظاہر تھا کہ وہ عورت میڈ سرونٹ ہے۔ گھرانا روایتی متمدن۔

فوارے کے پاس پودے کی اوٹ میں ایک خاتون بیٹھی تھی۔ پوز ایسا کہ آدھی ظاہر آدھی مستور۔ میں نے ظاہر کو غور سے دیکھا۔ آدھی خاتون آدھی لڑکی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب لڑکی کا دور نہیں آیا تھا۔ ابھی خاتون براجمان تھی۔

بیٹھنے کے انداز میں وقار تھا۔ ٹھہراؤ تھا۔ چٹ کپڑی خاتون کا سا ٹھہراؤ۔ لیکن چٹ کپڑی پر اگرچہ رنگ کی دھاریاں نہیں تھیں لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہیں۔ بازو خاتونی تھے۔ حسن قیام سے لدے پھندے، ہاتھ لڑکیانہ۔ انگلیاں بے چین، مضمحل خمیدہ۔ اوپر سے سفید اندر سے حنائی۔ جسم خاتونی، پاؤں لڑکیانہ، چلتے چلتے سنبھلتے پھر چلتے۔ چہرہ خاتونی، آنکھیں لڑکیانہ، متکلم شوخ چنچل۔ گفتگو ٹھیٹھ خاتونی۔ فرزانہ۔

مجھے دیکھ کر جھکی۔ "آداب عرض ہے۔"

چغتائی رنگ۔ نوابی انگ۔

"معاف کیجئے ہم نے آپ کو تکلیف دی۔" وہ رکی۔ "ہم آپ سے ملنا چاہتے تھے۔۔"

اس روز میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ہم خاتون کو دیکھا تھا۔ ہم صاحب تو بہت دیکھے تھے۔ انا کے چھینٹے اڑاتے تھے۔ اتنے کہ ہم تہذیب کے خلاف بغض سا ہو گیا تھا۔ اس روز خاتون کا "ہم" انا کے چھینٹے نہیں اڑا رہا تھا۔ وقار تھا۔ بے نیاز حسن تھا۔ پتہ نہیں کیا تھا۔ میں نے ہم تہذیب کو صدق دل سے معاف کر دیا۔

چند ایک ساعت کے لئے وہ رکی پھر بولی۔

"ہم آپ کو جانتے ہیں۔ دیر سے جانتے ہیں۔
آپ کو پڑھتے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔"

"میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ ...."

میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"قطعی نہیں" وہ بولی۔ "رسمی بات نہ کیجئے۔

آپ کی تحریروں کو اچھا جاننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ رسمی نہیں لکھتے۔"
میں بوکھلا گیا۔ کہنے کو میرے پاس کچھ نہ تھا۔
وہ خاموش تھی۔ صرف آنکھیں روشن تھیں اور وہ قریب آ رہی تھیں اور قریب اور قریب۔
میں ان کالے بولے گہرے کنوؤں سے ڈر گیا۔
"آپ کا نام!" میں نے خاموشی کو توڑا۔
کوئی سا بھی رکھ لیجئے۔ وہ بولی۔ رکی۔ "اچھا سا رکھیئے گا۔"
"آپ کہاں رہتی ہیں۔"
"کہیں بھی نہیں۔"
"پھر بھی۔" میں نے ضد کی۔
"بے کار ہے۔" وہ بولی۔ "یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔"
"لیکن کیوں۔"
"ہر بات کا کیوں نہیں ہوتا۔"
"وجہ۔" میں اڑ گیا۔
"ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے۔"
"بدل نہیں سکتا کیا۔"
"بدل سکتا ہے۔ لیکن ہمیں بدلنا گوارہ نہیں۔"
اس نے بات پر مہر لگا دی۔
پھر سے خاموشی چھا گئی۔ پھر وہی آنکھیں ابھریں۔ ابھرتی گئیں۔ ابھرتی گئیں۔ چھا گئیں۔
ہاں وہ آنکھیں۔ دو آنکھیں۔ میں نے نینی کی آنکھوں کو از سر نو دیکھا کافی مشابہت تھی۔
جب اس نے کہا تھا۔ کوئی سا نام رکھ لیجئے۔ اچھا سا رکھیئے گا۔ تو مجھے خیال آیا تھا۔
"مرگ نینی" اونہوں۔ مرگ کی آنکھ تو دکھنے والی ہوتی ہے۔ دیکھنے والی نہیں۔
شاید یہ تحفہ اسی نے بھیجا ہو۔ میں نے سوچا۔ لیکن امانت تحفہ سے کیا مطلب۔

بیک وقت امانت بھی، تحفہ بھی۔ سوچتا رہ۔ سوچتا رہا۔ مٹکی میں پانی ڈال کر بلوتا رہا۔ مکھن نہ نکلا۔

بوندوں کی میری زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔

میں ایک جذباتی آدمی ہوں لیکن جذبہ مجھ میں فوارے کی طرح ایک دم نہیں پھوٹتا۔

پہلے بوند بوند گرتا ہے۔ دل میں گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بوند بوند۔ پھر بھر جاتا ہے۔ اتنا جیسے سمندر ہو مدوجزر اٹھتا ہے۔ طوفان چلتے ہیں۔

میرے دل کی بناوٹ ہی ایسی ہے۔

بڑے سے بڑا غم دھچکا نہیں لگاتا۔ بوند بوند گرتا ہے۔ بھر جاتا ہوں۔ پھر طوفانی چھینٹے اڑتے ہیں۔ چھٹتے ہیں۔ بڑی سے بڑی خوشی۔ شادی مرگ نہیں کرتی۔ بوند بوند جمع ہوتی ہے پھر وجدان کی پھلجھڑی چل جاتی ہے۔ عشق دھارے میں نہیں آتا۔ بوند بوند اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ پھر انجانے میں کسی بوتل سے جن نکل آتا ہے۔ چھا جاتا ہے۔ پھر نہ ناؤ رہتی ہے نہ سمت رہتی ہے۔

میری شخصیت ازل سے بوند بوند ہے۔

میں اسے جانتا تھا۔ پہلے انجانے میں جانتا تھا۔ پھر پاگ بابا نے شعور دے دیا۔

پاگ بابا کے پاس مجھے اماں لے کر گئی تھی۔ اماں مجھ سے بڑی دکھی تھی۔ وہ صراط مستقیم تھی۔ میں سانپ چال تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میری چال میں بل نہ رہے۔ اسی لئے وہ مجھے پاگ بابا کے پاس لے گئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا بابا جی دعا کریں۔ اس کے لئے دعا کریں۔

بابا نے مڑ کر میری طرف دیکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا، بولا۔ اس کے لئے دعا کروں۔ اس کے لئے کیا دعا کروں۔ یہ تو بوندوں والا ہے۔ لے جا اسے۔ اندر بھی بوندیں۔ باہر بھی بوندیں۔ لے جا اسے۔

پتہ نہیں بوندوں والا سے بابا کا کیا مطلب تھا۔

میں سمجھا کہ میں لاعلاج ہوں۔ اماں سمجھی کہ برکت والا ہوں۔ گھر جا کر اماں نے فخر

سے سب کو بتایا کہ میں بوندوں والا ہوں۔ محلے والوں نے تحسین بھری نظروں سے مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔

ایک دن پتہ نہیں کس بات پر جب میرے دل میں غم بوند بوند ٹپک رہا تھا۔ تو مجھے بابا کی بات یاد آگئی۔ بابا نے کیسے جان لیا کہ میں ازلی بوند بوند ہوں۔ لیکن باہر کی بوندوں سے اس کا کیا مطلب تھا۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔

نینی کی آمد سے کچھ دیر بعد ایک نئی بات عمل میں آئی۔ دل میں نئی سی بوندیں گرنے لگیں جنہیں نہ غم سے تعلق تھا نہ خوشی سے نہ عشق سے۔ جیسے سوکھے کاٹھ پودے کو نمی مل رہی ہو۔ بے جان باسی چیز میں تازگی سرایت کر رہی ہو۔ ریت کے تودے میں سے ہری کونپل پھوٹ رہی ہو۔

یہ کیسی بوند ہے جو تھکے ہارے اکتاہٹ کے ڈھیر میں دبے ہوئے میں زندگی کی رمق جگا رہی ہے۔

سوچ سوچ کر ہار گیا۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ بھید نہ کھلا۔ کاٹھ میں بوندیں گرتی رہیں۔ بوند بوند گرتی رہیں۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔

پاگ بابا مسکراتا رہا۔ تم تو بوندوں والے ہو۔ کنزہ گھنیاں کی طوائف گنگناتی رہی۔

بڑی بڑی بوندن۔

برسیں نینوا۔ بڑی بڑی بوندن۔

پھر ایک دن دروازہ بجا۔

باہر چٹھی رساں کھڑا تھا۔ مجھے ایک لفافہ تھما دیا۔

خط انجانا تھا۔ بے دلی سے کھولا۔ نیچے کوئی نام نہ تھا۔ اوپر پتہ نہ تھا۔ میں چونکا۔ یہ کیا چیز ہے۔ لکھا تھا۔

وقت آگیا ہے کہ بات کہہ دی جائے۔

ہم اور تم

اگر خدا دونوں میں ایک ہی کو پیدا کرتا تو شاید دنیا میں دکھوں کی ایک بوند کم ہو جاتی۔

کیسے بتائیں۔ اس ایک بوند کے سمندر کی ہماری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ اس میں کتنے رنگ گھلے ہیں۔ یہ دکھ کا پانی کتنا میٹھا ہے۔

تم ہرگز سمجھ نہیں سکے۔

ہمیں کامل یقین ہے تم اس سمندر کی گہرائی میں جھانک ہی نہیں سکتے۔

یہ ایک بوند تو ہمارا سرمایہ حیات ہے۔

تم پورے پورے سمندروں میں بیسیوں بار ڈوب کر صحیح سلامت نکل چکے ہو۔ تم لوگوں کے لئے ڈوبنا، نکلنا، کپڑوں سے چھینٹے جھاڑ کر آگے بڑھ جانا روزمرہ کا کھیل ہے۔

تم اس کی کیفیت کو کیسے سمجھ سکتے ہو جسے زندگی میں پہلی بار صرف ایک بوند ملی ہو اور وہ اسے سمندر جیسی وسعت اور گہرائی دیدے۔

انجانے میں ڈوب جائے ـــــ اور چاہنے کے باوجود نکلنا نہ چاہے اس ڈر سے کہ اگر یہ پانی خشک ہو گیا تو ـــــــــ

یہ ایک بوند تو ہمارا سرمایہ حیات ہے۔

اب ہماری امارت نینی لوٹا دی جائے پوسٹ بکس ۶۴۲۱ کراچی۔

بوندوں کا سارا بھید کھل گیا ـــ یا شاید ـــ اور بھی گہرا ہو گیا۔

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر





۵۵ سال کہانیاں لکھنے کے بعد

میں نے جانا کہ ہمارا بنیادی مسئلہ

"میں" ہے۔

"میں" کے حوالے سے دیکھو

تو زندگی مسائل سے بھری ہوئی ہے۔

کتنا آسان حل ہے کہ :

"میں" کے بند گنبد میں کوئی کھڑکی کھول لو۔

میں نے ہمیشہ "میں" پر کہانی لکھنے کی

کوشش کی لیکن :

"کہی نہ جائے"

ممتاز مفتی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور کراچی راولپنڈی

969 0 01082 4

Rs. 125.00